زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مئی ۲۰۲۵ء

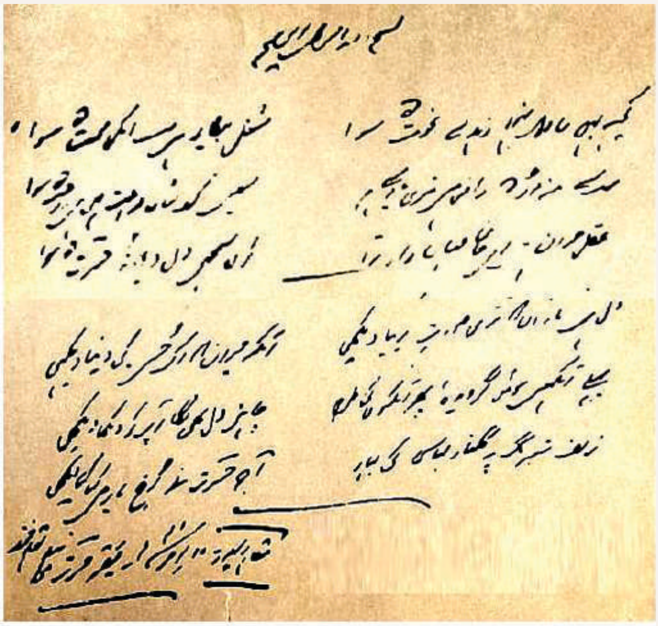

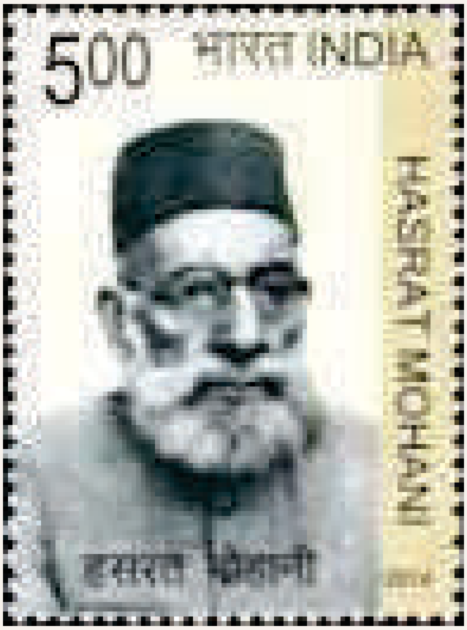

غزل

بدلے ہوئے انداز سے حیراں ہوئی تصویر
دیکھا مجھے انگشت بدنداں ہوئی تصویر

اس دشت نما گھر میں ہوا جشن نگاراں
جب خانۂ دل میں تری چسپاں ہوئی تصویر

محبوب کو اس سینۂ پر خوں میں رکھا تھا
کھنچ آئی تو پھر لعل بدخشاں ہوئی تصویر

ہے جامہ قرطاس میں وہ مہر گل اندام
جتنی ہی ڈھلی ، اتنی نمایاں ہوئی تصویر

رضواں کو تھا باغِ اِرم آرائی پہ صد ناز
کیا عکس غزل ہے کہ پرستاں ہوئی تصویر

وہ کیا رُخ گل تھا ، کہ گل افشاں ہوا موسم
وہ کیا گل تن تھا کہ گلستاں ہوئی تصویر

دیکھا ہے عدیؔم آپ نے تصویر غزل کی
کہئے تو ذرا کیسے غزل خواں ہوئی تصویر

ظفر عدیؔم

ظفر عدیؔم کا اصل نام محمد جاوید حسین ابن سید ابوظفر ہے، لیکن ادب وصحافت اور شاعری کی دنیا میں وہ اپنے قلمی نام ہی سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی ولادت مہوا ویشالی میں ۲۶ مئی ۱۹۵۰ء کو ہوئی اور ۶ رنومبر ۲۰۱۳ء کو دہلی میں انہوں نے وفات پایا۔ ''مدرسہ اسلامیہ جامع العلوم'' میں ابتدائی تعلیم کے بعد عابدہ ہائی اسکول، مظفر پور سے ۱۹۶۳ء میں انہوں نے میٹرک کیا اور سہرسہ کالج سے ۱۹۶۵ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے بی ایس سی میں داخلہ لیا، لیکن سند نہیں لے سکے۔ ظفر عدیؔم کی باضابطہ شاعری کا سال آغاز ۱۹۶۵ء ہے۔ نومبر ۱۹۷۷ء میں انہوں نے مظفر پور سے ماہنامہ ''انجو'' کا اجرا کیا اور اسی سال ناول ''انجو'' اور ناول ''رات کے آنچل میں'' کی اشاعت ہوئی۔ ظفر عدیؔم نے پہلے پہل ''انجان ڈگر'' کے نام سے بھی ناول لکھا تھا، مگر وہ شائع نہیں ہوسکا۔ ۱۹۸۰ء میں وہ ''تیج'' ویکلی، نئی دہلی اور فلمی رسالہ ''نیلو'' سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۸۶ء میں ''منظوم واقعہ جمعتہ الوداع'' کی تخلیق کی۔ ۱۹۸۹ء میں روزنامہ ''قومی آواز'' سے منسلک ہوئے اور اسی سال ماہنامہ ''جرائم'' نئی دہلی میں ان کے ناول ''یاسمین'' کی فروری سے قسط وار اشاعت شروع ہوئی جس کا سلسلہ جولائی ۱۹۹۰ء میں مکمل ہوا۔ ۱۹۹۲ء میں ان کی خصوصی مساعدت سے فیض یافتہ کتاب ''لغات ابجد شماری'' کی اشاعت کے سلسلہ کا آغاز ہوا جو ۱۹۹۹ء میں تکمیل کو پہنچا۔ جنوری ۱۹۹۳ء سے جون تک اُن کے ناول ''پہاڑیاں بول اُٹھیں'' کی مکمل قسط وار اشاعت کے بعد، اسی سال جولائی سے مارچ ۱۹۹۴ء تک ان کے ناول ''اُڑان'' کی مکمل قسط وار اشاعت ہوئی۔ ظفر عدیؔم کا شعری مجموعہ ''بھینی بھینی مہک'' (۲۰۰۳ء) ان کی مترجمہ کتاب ''اجودھیا'' (۲۰۰۶ء) ناول ''شوفر'' (۲۰۰۷ء) کے علاوہ ۲۰۰۸ء میں ان کے منظوم ڈرامہ ''لالہ رُخ'' ناول ''یاسمین''، اور ناول ''سڑک سیدھی جاتی ہے'' کی بھی اشاعت ہوچکی ہے۔ ''دیوان عدیؔم'' کا سال اشاعت ۲۰۰۹ء ہے اور ان کے خاکوں اور انشائیوں کا مجموعہ ''ہر چہ باداباد'' اور مترجمہ کتاب ''نہرو کی سیاسی فکر'' بھی ۲۰۱۱ء میں اشاعت یافتہ ہے۔

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر

ابرار احمد خان

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۶ شمارہ : ۵

مئی ۲۰۲۵ء

زرتعاون : پندرہ روپے

سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ : سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	ابراراحمد خان	۳
حسرتؔ و شوکت	حسرتؔ موہانی اوران کے مطلع اور مقطعے	محمد پرویز اختر	۴
	شوکت تھانوی: تبسمات کافن کار	پروین اشرفی	۱۱
عطاء و شبّر	شبر امام کی عطاء اللہ پالوی شناسی	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۵
	پالی کے دورتن: عطاء اللہ اور شبر امام	ایم احمد توصیف	۲۱
پرویزؔ و انجمؔ	پرویزؔ شاہدی کی غزل گوئی	ڈاکٹر سید اشہد کریم	۲۴
	حامد الانصاری انجمؔ: شخصیت اور شاعری	ساحرؔ داؤد نگری	۳۲
مقالات	ناصر علیؔ سرہندی اوران کے ممیّزاتِ سخن	ڈاکٹر صابر علی سیوانی	۳۹
	فیض احمد فیضؔ کی مزاحمتی شاعری	ڈاکٹر محمد مجاہد حسین	۴۴
	ترقی پسند اردو تنقید میں موضوع ومواد......	ممتحنہ اختر	۴۸
افسانے	تصادم	ڈاکٹر نریشؔ	۵۲
	مدعا	ارشد منیم	۵۵
منظومات	نعت پاک	افسر جمال افسرؔ	۵۶
	بے سمت رفتارِ زندگی	سلطان احمد ساحلؔ	۵۷
	غزلیں	نفیسؔ خیرآبادی / صدام غنی	۵۸
	غزلیں	مناظر حسن شاہینؔ	۵۹
	غزلیں	سائرہؔ عظیم	۶۰
	غزلیں	ڈاکٹر فرحت حسین خوشدلؔ	۶۱
	غزلیں	ماسٹر محمد سعیدؔ نقشبندی	۶۲
	غزلیں	ڈاکٹر محمد زاہدؔ / شکیلؔ ہاشمی	۶۳
کتابوں کی دنیا	انسانیت اور محبت کا شاعر...... سریندر دیول	مبصر: خالد عبادی	۶۴
	افکارِ نوبہ نو سید نفیسؔ دسنوی	مبصر: ڈاکٹر رفیق احمد	۶۶
سلام و پیام	ڈاکٹر ایم ضیاء الدین احمد، حناؔ نسیم، شرف الہدیٰ، سلطان احمد ساحلؔ، ایم احمد زبیر		۷۰

بچوں کا زبان وادب

۷۳ —— ۸۰

''زبان وادب''میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

حرف آغاز

شکرو سپاس مالک افلاک وارضین کا ـــــ اربابِ علم وقلم کی ولادت ووفات کے مہینے اور رسالہ کے ماہِ اشاعت کی مناسبت سے ''زبان و ادب'' کا تازہ شمارہ چند خصوصی کالموں کے ساتھ آپ کی نذر ہورہا ہے۔ان میں ''حسرتؔ و شوکت'' کے تحت جہاں حسرتؔ موہانی کی سوانح وشخصیت، عصر وماحول اور ناقدین کے اقوال کا حوالہ لیتے ہوئے ان کے کلام کی مزیت اور بالخصوص راست متنی مطالعہ کے ساتھ اُن کے غزلیہ مطلع ومقطع کی موضوعاتی اور اسلوبیاتی خوبیاں سامنے لائی گئی ہیں، وہیں طنز ومزاح کے معروف زمانہ فن کار شوکت تھانوی کی زندگی، ان کی تبسم بداماں تصانیف اور متنوع نثری اصناف میں ان کے تحریری فضائل کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی شاعری کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ بعدازیں ''عطاء و شبر'' کے تحت پالی کے دوادبی رتن عطاء اللہ اور شبر امام کے احوال وآثار بتاتے ہوئے اُن کے باہمی علمی وفکری رشتہ کی نشاندہی کی گئی ہے اور خصوصی طور پر شبر امام کی کتاب ''عطاء اللہ پالوی: نقیبِ فکر وآگہی'' کا تعارفی تجزیہ ہوا ہے، جب کہ ''پرویزؔ وانجمؔ'' کے تحت ''پرویزؔ شاہدی کی غزل گوئی'' پر کچھ تازہ نکات کے ساتھ باتیں ہوئی ہیں اور حامد الانصاری انجمؔ کی شخصیت وشاعری کے بارے میں متنوع جہتوں سے وقوف بخشا گیا ہے۔

مذکورہ خصوصی کالموں کے بعد ''مقالات'' کا وہ جہانِ تثلیث حاضر ہے جو ایک طرف مستند حوالہ جات کے ساتھ ناصر علیؔ سرہندی کے عہد وماحول، ان کی قلندرانہ شخصیت اور اُن کے ممیزاتِ سخن، روشن کردیتا ہے تو دوسری طرف تجزیاتی وشعری حوالوں کے ساتھ ''فیضؔ کی مزاحمتی شاعری'' کے کئی گوشے بھی اُجالے میں لادیتا ہے اور تیسری طرف نہایت متانت کے ساتھ ''ترقی پسند اردو تنقید میں موضوع ومواد کی تقدیم کا مسئلہ'' بھی مبرہن کرجاتا ہے۔

اس شمارے کے ''افسانے'' بالترتیب ''تصادم'' اور ''مدعا'' کی سرخیوں سے زینت پارہے ہیں۔ اوّل الذکر کہانی میں دراصل جنسیت اور روحانیت کا وہ ذہنی ونفسیاتی ''تصادم'' دیدنی ہے جو نہ صرف ایک ڈرامائی فضا بناتا ہے، بلکہ اپنے دوست سے بار بار تبادلہ خیال کے بعد بھی روبی کے متعلق پرمود کو مخمصہ کے اُس دلدل سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہونے دیتا ہے جو درحقیقت اُس کے اپنے کردار کا تجرباتی دلدل ہے، جب کہ موخرالذکر کہانی میں پوشیدہ نفسیاتی منافقت اس کے چونکا دینے والے کلائمکس سے سامنے آجاتی ہے اور یہ بتاجاتی ہے کہ اگرچہ بعض حالات میں مثبت اور شریفانہ مزاج وکردار کو انکار کے ''مدعا'' کا محرک سمجھ لیا جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی نہ صرف سچائی اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے بلکہ وہ غیر شعوری طور سے خود ہی لبوں تک بھی آجاتی ہے۔

ہمیں پوری امید ہے کہ متذکرہ مشمولات ہی نہیں بلکہ اس شمارے میں نعت ونظم اور غزلوں سے مرصع منظوماتی حصے بھی مطبوعِ خاطر ہوں گے۔ ''کتابوں کی دنیا'' بھی خوشگوار دکھائی دے گی اور ''بچوں کا زبان وادب'' بھی مضمون، کہانیوں اور نظموں کے ایک حسین گلدستہ کی طرح جاذبِ نظر ہوگا اور ان کے مطالعہ کی دنیا میں دیر تک اور دور تک اپنی تازہ خوشبو بکھیرتا رہے گا۔ زیادہ انہیں سطروں کے ساتھ خدا حافظ، خدا ناصر!

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

حسرت و شوکت

محمد پرویز اختر
Damodarpur, Muzaffarpur - 843113 (Bihar)

حسرت موہانی اور ان کے مطلع اور مقطعے

اردو شاعری کی تاریخ میں حسرتؔ تخلص رکھنے والے دو غزل گو شاعر علی الخصوص مشہور ہیں۔ ان میں ایک تو اٹھارہویں صدی کا زمانہ پانے والے جعفر علی خاں حسرتؔ ہیں جو ۱۷۳۵ء میں پیدا ہوئے اور محض پچاس سال کی عمر پا کر ۱۷۸۵ء میں اس دنیا سے چل بسے۔ ان کے استاد رائے سرب سنگھ دیوانہؔ کو چاہے تاریخ نے برائے نام یاد رکھا ہو، لیکن ان کے شاگرد شیخ قلندر علی بخش جرأتؔ لکھنوی سے ایک زمانہ واقف ہے۔

حسرتؔ تخلص اختیار کرنے والے دوسرے معروف شاعر سید فضل الحسن حسرتؔ ہیں جو جعفر علی خاں حسرتؔ کی وفات سے دس سال پہلے اس دنیا میں آئے اور تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کا شمار ہندوستان کے مجاہدین آزادی میں ہوتا ہے اور عام زبان میں وہ مولانا حسرتؔ موہانی کہلاتے ہیں۔ وہ ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں یکم جنوری ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے اور ۱۳؍مئی ۱۹۵۱ء کو ہماری دنیا چھوڑ گئے اور لکھنؤ کے فرنگی محل قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

حسرتؔ موہانی کا تعلق نیشاپور کے سادات خاندان سے تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ کا نام سید محمد محمود نیشاپوری ہے۔ حسرتؔ موہانی کے والد اظہر حسین تھے اور والدہ شہر بانو۔ انہوں نے زمانے کے لحاظ سے حسرتؔ کی تعلیم کے بہترین بندوبست کئے۔ ایک طرف ابتدائی

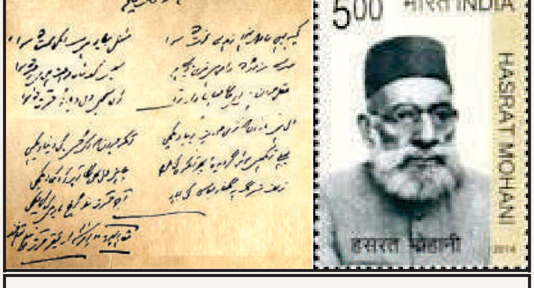

عکس تحریر: اوراقِ گل، محمد حسین خاں شفاؔ، رام پور سے ماخوذ
بہ شکریہ ماہنامہ "آج کل" نئی دھلی اگست ستمبر ۱۹۸۱ء روبرو ص۴۲

تعلیم کے بعد انہوں نے اردو اور فارسی کی کتابیں پڑھیں اور دوسری طرف ۱۸۹۴ء میں مڈل اسکول اور ۱۸۹۷ء میں ہائی اسکول کے امتحانوں میں کامیابی پائی اور پھر ایم اے او کالج میں زیر تعلیم رہے اور ۱۹۰۳ء میں گریجویٹ کی سند لی۔ حسرتؔ کو شاعری میں تسلیمؔ لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل ہے جو مومنؔ دہلوی کے شاگرد خاص نسیمؔ دہلوی سے شرف تلمذ رکھتے تھے اور اسی اعتبار سے حسرتؔ نے اپنی شاعری میں لکھنؤ کی زبان اور دہلی کا رنگ ہونے کا دعویٰ کیا ہے جو چنداں غلط بھی نہیں۔

حسرتؔ موہانی کی زندگی اور ان کی سرگرمیوں کا ایک رُخ صحافت و سیاست اور نثری ادب سے بھی جڑا ہوا ہے۔ انہوں نے یکم جولائی ۱۹۰۳ء کو ''اردوئے معلّیٰ'' کا پہلا شمارہ نکالا تھا جس کی اہمیت اور جس کے اثرات معلوم و مشہور ہیں اور یہ بات بھی داخل انکشاف نہیں کہ برطانوی ہند میں انہیں بار بار قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا، نظر کے چشمے سے محروم کر دئے جانے کی صورت میں انہیں طرح طرح کی دقتیں اٹھانی پڑیں اور قید خانے میں چکی پیسنے کی مشقت بھی وہ نہایت ہی صبر و استقلال کے ساتھ جھیلتے رہے۔

مقدمہ ''مشاہدات زنداں'' مطبوعہ ۱۹۹۰ء میں لکھا ہے کہ دوران اسیری جیل کے حکام جب انہیں علی گڑھ سے نینی تال لے جارہے تھے تو الٰہ آباد ریلوے اسٹیشن پر ان کے والد نے انہیں دیکھا تھا، لنگوٹ پہنے اور ہتھکڑی اور بیڑی سے آراستہ —— اس منظر کا اُن پر شفقت پدری کے باعث ایسا زبردست ذہنی و نفسیاتی اثر پڑا کہ پھر وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکے۔

حسرتؔ اُن خوش بخت لوگوں میں سے تھے جن کی اہلیہ نے بھی اُن کے سیاسی مشن میں پوری طرح ان کا ساتھ دیا تھا۔ ایک بار جب ان کی دودھ پیتی بچی نعیمہ سخت بیمار تھی اور وہ گرفتار ہوئے تھے تو ان کی

نصف بہتر نشاط النساء نے نہ صرف گھر اور کھدر کی دوکان سنبھالی تھی بلکہ اپنے شوہر کو ایک خط میں پامردی کی زبردست تلقین بھی کی تھی۔ جہاں تک حسرتؔ کی ادبی خدمات کا معاملہ ہے۔ ''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا'' (ج ا) میں غلط نہیں لکھا ہے کہ:

''حسرتؔ ادبی محقق بھی تھے، ان کا علمی کام وقیع ہے، ان کے توسط سے اردو کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی و تنقیدی کام کرنے کی فضا عام ہوئی۔ ایک دیوان ان کی یادگار ہے اور (انہوں نے) غالبؔ کی شرح بھی لکھی ہے جو ان کا بڑا کارنامہ ہے۔''

حسرتؔ موہانی کی زندگی اور شخصیت کے متنوع، مذکورہ پہلو اپنی جگہ چاہے کتنی ہی اہمیت رکھتے ہوں، لیکن صاف ستھری بات یہی ہے کہ جہانِ ادبیات میں حسرتؔ کو ان کے جس کارنامے سے عمر دوام کی دولت ملی ہے، وہ ان کی شاعری ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخ'' (مطبوعہ کشمیر ۱۹۸۷ء) میں جہاں مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرتؔ موہانی کو خلافت تحریک کے زمانے میں اشتراکی روس کے زیر اثر ملکوں کے سفر سے ہندوستان واپسی کے بعد ''اشتراکی خیالات کا استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے'' بتایا ہے، وہیں حسرتؔ کے تعلق سے صاف لفظوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''وہ غزل کے سر برآوردہ شاعر تھے، لیکن ان کی غزل اپنے عہد کی نظمیہ شاعری کے ارتقا اور اس کے ارتسامات سے پوری طرح متاثر تھی، چنانچہ انہوں نے غزل کو بھی اس کے ہاتھی دانت کے برج سے نیچے اُتار کر عملی زندگی کے میدان میں لانے کی کوشش کی، اس سے اردو غزل نے حیاتِ نو پائی اور نظم کے مدمقابل ہو کر نمودار ہوئی۔ حسرتؔ موہانی نے سوویت نظام کو 'عربی سودیت' یعنی مساوات سے متعلق کرلیا تھا، چنانچہ انہوں نے اس کے بارے میں خود لکھا تھا ؎

ہدایت کا زمانہ تشنہ تھا، اہل سودیت نے
دکھائی سب کو راہ حریت بے خوف دیں ہوکر''

حسرتؔ کی شاعری کا یقیناً یہ ایک خاص پہلو ہے اور اس سے آگے بڑھ کر مجموعی طور پر اُن کی غزلیں دیکھی جائیں تو اس بات سے بھی انکار کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ:

''حسرتؔ کی عمر اگرچہ سیاسی اور سماجی زندگی کے طوفان میں گزری۔ ملک کی تحریک آزادی، عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں میں انہوں نے اہم حصہ لیا، باوجود اس کے حسرتؔ اُن اردو شاعروں کے میر کارواں ہیں، جنہوں نے نظم جدید کے مقابلے میں اردو غزل کی ساکھ دوبارہ قائم کی، چنانچہ حسرتؔ رئیس المتغزلین کہلائے۔ خلوص، بیباکی اور حق گوئی ان کی شاعری کے اہم عناصر ہیں اور انہیں کی ترجمانی سے انہوں نے غزل کو نئی لذت سے آشنا کیا۔ حسرتؔ نے بلاشبہ اردو غزل کو ایک ایسی لطافت بخشی جو روایتی رنگینی و رعنائی کے باوجود اتنی پاکیزہ ہے کہ اس کی مثال ان کے کسی ہم عصر کے یہاں نہیں ملتی۔'' (اردو انسائیکلوپیڈیا، ج ا، ص ۶۸)

کم وبیش یہی بات مختلف انداز میں اور لفظوں کے دروبست کی تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ حسرتؔ کے دوسرے ناقدین نے بھی لکھی ہے، مثال کے طور پر ''مختصر تاریخ ادب اردو'' میں ص ۱۳۴ پر ڈاکٹر سید اعجاز حسین کا یہ تجزیہ سامنے آتا ہے کہ:

''بے کیفی کو دور کرکے تغزل کو تیز کرنا حسرتؔ کا خاص کارنامہ ہے...... قدیم استادوں کے کلام سے فطری شغف ...... اور پرانے لوگوں کی تقلید میں مسلسل غزلیں (کہنے اور) پرانے الفاظ کا استعمال روا (رکھنے کے باوجود) ان کا کلام الجھاؤ اور بیکار باتوں سے پاک ہے اور صفائی و شیرنی خاص طور پر ان کے یہاں قریب قریب ہر جگہ موجود ہے۔ ان کا کلام نہ تو سراپا یاس و نامرادی کا مرقع ہے اور نہ عیش ونشاط کی محفل ...... حسرتؔ کو زمین کے انتخاب کا خاص ملکہ تھا جس کی وجہ سے ان کے کلام میں روانی اور شگفتگی بہت پیدا ہوگئی ہے اور بول چال کا

لطف بھی کافی رہتا ہے۔''

حسرؔت نے جو شعر بحالت سوز و گداز کہا ہے، بقول زوار حسین زیدی ''اس کا مزہ دل سے زائل نہیں ہوتا'' اور عظیم الحق جنیدی کے لفظوں میں:

''۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۲ء تک حسرؔت کی غزل گوئی کا بہترین دور ہے، اس عرصہ کے کلام مین واقعیت، معنویت، شیر نیت، لطافت، ندرت و جدت اور لطف و اثر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔'' (اردو ادب کی تاریخ، ص ۱۴۴)

مذکورہ اقتباس میں حسرؔت کی بہترین غزل گوئی کے دور کی جو تعین کی گئی ہے، عین ممکن ہے کہ اس پر کچھ پہلوؤں سے مطالعاتی و شواہدی ایراد و بحث کی گنجائش نکل آئے، لیکن جیسا کہ صغیر احمد جان نے اپنی کتاب ''تنویر ادب'' کی دسویں اشاعت ۱۹۸۱ء میں ص ۱۵۲ پر لکھا ہے، اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ:

''عام طور پر جیتا جاگتا اور مجازی عشق حسرؔت موہانی کی شاعری کی روح رواں ہے۔ حسن میں دلکشی، ناز و انداز، غنج و دلال، نخوت و بے نیازی، شوخی و لگاوٹ ہے۔ عشق میں والہانہ شیفتگی و دیوانگی، جوش اور شدائد جذبات ہے۔ ان کے اشعار میں سادگی، جوش، اصلیت، نزاکت اور بانکپن کے امتزاج سے وہ چیز پیدا ہوتی ہے جسے تڑپ کہئے یا تاثر یا شاعرانہ انبساط کہہ کر اس مفہوم کو ادا کیجئے۔''

یہ دراصل حسرؔت کے رنگ شاعری کی خوبی و خوبصورتی کا بیان ہے اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ حسرؔت کے مطلعے اور مقطعے نسبتاً آسانی سے ان خوبیوں کی بھی اور مزید دیگر خصائص کی بھی توثیق کر دیتے ہیں جن کی طرف حسرؔت کو تہذیب عاشقی یا یک گونہ معاملہ بندی کا شاعر قرار دینے والے تجزیہ کار اشارے کرتے رہے ہیں۔ آگے

بڑھنے سے پہلے یہاں حسرؔت کا ایک مشہور شعر نقل کرنے میں مجھے کسی قباحت کا امکان نظر نہیں آتا۔

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرؔت کی طبیعت بھی

میں نے اس شعر کی پیش کش یہاں اس لئے پسند کیا ہے کہ ایک طرف دونوں مصرع میں قافیہ و ردیف کے استعمال سے اس میں مطلع کی ساخت مل رہی ہے اور دوسری طرف تخلص کا استعمال اس وصف کی یاد بھی دلا رہا ہے جو مقطع میں پایا جاتا ہے۔

حسرؔت مہانی کے مطلعے اور مقطعے پر براہ راست گفتگو سے پہلے مناسب ہے کہ درج ذیل اقتباس سامنے رکھا جائے جس میں ان دونوں اصطلاحوں کی وضاحت موجود ہے۔ یہ اقتباس شمیم احمد کی کتاب ''اصناف سخن اور شعری ہیئتیں'' مطبوعہ ۱۹۸۱ء ص ۵۹ تا ص ۶۱ سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے ہیئتی صنف غزل کے تعلق سے اپنی کتاب کے تیسرے باب میں لکھا ہے کہ:

''ہیئت کے اعتبار سے غزل کے اجزائے ترکیبی یوں ہیں: مطلع، قافیہ، ردیف، مقطع۔ غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں...... غزل کی ہیئتی ترکیب کی آخری چیز مقطع ہے...... مقطع غزل کا آخری شعر ہوتا ہے اور اس کی شناخت یہ ہے کہ شاعر اس میں اپنا مختصر سا نام، جسے اصطلاحاً تخلص کہا جاتا ہے، استعمال کرتا ہے...... غزل میں مطلعے اور مقطعے کے وجود کا ایک نفسیاتی جواز ضرور ہے۔ مطلع کے معنی ہیں، طلوع ہونے کی جگہ، لہٰذا مطلع وہ شعر ہوا جس سے غزل کا آغاز ہوتا ہے، اسی سے یہ تعین ہو جاتا ہے کہ اس غزل کی بحر کیا ہوگی، اس کے قافیے ردیف کیا ہوں گے۔ 'مقطع' کے معنی ہیں 'قطع ہونے کی جگہ' آخری شعر میں شاعر کے تخلص سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب اس نے اپنی بات ختم کر دی ہے۔ جس مخصوص ذہنی رو اور موڈ کے تحت سارے اشعار معرض تخلیق میں آئے تھے، ان کا سلسلہ اب ختم ہوا ہے اس طرح دیکھا جائے تو مطلع دراصل غزل کا نقطہ آغاز ہے اور مقطع نقطہ اختتام۔''

اس سے قطع نظر کہ اس اقتباس کی باتوں پر فنی بحث کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے، مثلاً جہاں تک خاص ہیئت کا سوال ہے، اس ہیئت میں ایک مفرد شعر یا جہاں تک استعمال تخلص کی بات ہے، اس کے ساتھ کوئی بھی شعر مطلع یا مقطع کہلا سکتا ہے، اِلا یہ کہ واقفیت کے بموجب اُسے مطلع نما یا مقطع نما کہہ کر وضاحت کر دی جائے، پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شعر ایسا بھی ہو جس میں مطلع کی ساخت بھی ملے اور شاعر کا تخلص بھی، جیسا کہ ابھی ذرا دیر پہلے حسرتؔ ہی کا ایک شعر نقل ہو چکا ہے، بہر حال یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ محض مطلعے اور مقطعے کی روشنی میں بھی شاعر کے کلام کا مطالعہ اس کے متنوع اوصاف تک پہنچا دیتا ہے، اس جہت سے جہاں تک کلام حسرتؔ کی بات ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلوں کے مطلعے اور مقطعے میں موضوع و بیان، طریق پیش کش، اسلوب و زبان اور صناعات شعری کے گونا گوں جلوے موجود ہیں۔

حسرتؔ موہانی کے اگر ٹوکری بھر اور مٹھی بھر نہ سہی چٹکی بھر مطلعے بھی بلا انتخاب سامنے رکھ لئے جائیں تو یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی کہ انہوں نے فلسفہ اور نفسیات کے مضامین نہایت عمدگی سے نظم کئے ہیں، مثلاً کہیں تجرباتی اظہار کی صورت میں بتایا ہے کہ زہد سے ایک قسم کی نخوت پسندی آ جاتی ہے، لہٰذا عشق و عاشقی کے سوا سارے شغل بیکار ہیں۔ حسرتؔ کا خیال ہے کہ وصل محبوب کی منزل بیم و رجا کے درمیان ہی ملتی ہے، اسے تصوف کی زبان میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ محبوب حقیقی کو پانے کا راز اس کے عتاب سے ڈرتے رہنے اور اس کے کرم سے امیدیں لگائے رکھنے میں ہی پنہاں ہے۔ اسی طرح حسرتؔ نے کہیں سوالیہ انداز میں بتایا ہے کہ نہ تو وصل و کامرانی کا مسئلہ عمل و کاوش کے بغیر محض ظاہری اور رسمی رویہ سے مثبت تدبیر کے روپ لے سکتا ہے اور نہ ہی محض آرزوؤں اور تمناؤں سے قسمت بدل سکتی ہے۔ ایک عاشق کے لئے ضروری ہے کہ وہ حسن یا محبوب کی نفسیات کو سمجھے اور اظہار تمنا سے بچے، اس لئے کہ تمناؤں کا اظہار معشوق کو انتہائی مغرور بنا دیتا ہے اور وہ اپنے جلوؤں کو اور بھی نکھارنے میں لگ جاتا ہے، جب کہ عاشق کی محویت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ نفسیاتی طور پر اس کے کانوں میں محبوب کی پکار گونجنے لگتی ہے اور وہ چونک اٹھتا ہے۔

جذبۂ شوق کدھر کو لے جاتا ہے مجھے
پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

منزل وصال یار ہے پیدا
درمیان حدودِ بیم و رجا

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا
شغل بیکار ہیں سب ان کے محبت کے سوا

مذکورہ مطالع بتا رہے ہیں کہ حسرتؔ کے یہاں عاشق و معشوق کی نفسیات شناسی بھی ہے، بر سبیل تذکرہ آفاقی صداقتوں کا بیان بھی اور بالواسطہ عمل واخلاص کی پیامی تلقین بھی۔

حسرتؔ کے مطلعوں میں ہماری ملاقات ایک ایسے عاشق سے ہوتی ہے جو کبھی نہایت الحاح اور لجاجت کے ساتھ اپنے حال زار اور اپنی بیتابی و بیقراری کا واسطہ دیتے ہوئے محبوب سے التجا کرتا ہے کہ ''ستائیے نہ مجھے، رُلائیے نہ مجھے'' کبھی یہ آرزو کرتا ہے کہ کاش میری شکایت اور تقاضے سے پہلے محبوب میرے گھر آ جاتا اور کبھی بہ انداز شکایت کہتا ہے کہ کبھی تو اپنا کرم عام کرو اور نامرادوں کو شاد کام کردو۔

نامرادوں کو شاد کام کرو
کرم اپنا کبھی تو عام کرو

میری جانب سے شکایت نہ تقاضا ہوتا
خود مرے گھر وہ چلے آتے کچھ ایسا ہوتا

ستائیے نہ مجھے یوں ہی دل فگار ہوں میں
رُلائیے نہ مجھے خود ہی بیقرار ہوں میں

حسرتؔ کے ان مطلعوں سے زبان کی سادگی بالکل ہی عیاں ہے، بعض

شعر تو اتنے بے ساختہ ہیں اور ایسے انداز میں کہ ان کی نثر بن ہی نہیں سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر مطالع حسرتؔ میں سہل ممتنع کی شان جا بجا جھلک رہی ہے۔ انہوں نے ایک طرف عاشق کی اَنا کو کہیں وطیرۂ عزم کے ساتھ دکھایا ہے، کہیں اس کے ڈانوا ڈول ہونے کی کیفیت کے ساتھ اپنے عزم کی تجدید کا منظر سامنے لایا ہے تو دوسری طرف کہیں اُس عاشق کو بھی ہمارے روبرو کر دیا ہے جو شوق کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے اور اپنی اَنا خود ہی توڑ دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔

لاکھ اس شوخ جفا کار سے پرہیز کرو
شوق پھر بھی یہی کہتا ہے سب انگیز کرو

لطف کی ان سے التجا نہ کریں
ہم نے ایسا کبھی کیا ، نہ کریں

کچھ میرے حال زار کی ان کو خبر نہیں
کیا میں ہی جا کے سنا دوں ، مگر نہیں

یہ ہیں عاشق کی بدلتی ہوئی ذہنی کیفیات کے عکوس جو حسرتؔ موہانی کے مطلعوں میں جا بجا ملتے ہیں اور بالکل ایسا لگتا ہے کہ جیسے معاملہ بندی بحسن تمام اپنے عروج کو پہنچ رہی ہے۔

حسرتؔ کی معاملہ بندی معلوم ومشہور ہے انہوں نے اپنے مطلعوں میں نہ صرف عشق بتاں کو جی کا جنجال ہونے کی بات کہی ہے اور عاشق کی تباہ حالی دکھایا ہے بلکہ ہمارے سامنے ایک ایسے معشوق کا کردار بھی آئینہ کر دیا ہے جو حد درجہ سنگ دل ہے، جس کی بے التفاتی حد سے سوا ہے، جو لینے کو تو عاشق کا دل پلک جھپکتے لے لیتا ہے، لیکن پھر پلٹ کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتا۔

کیا کام انہیں پرسش ارباب وفا سے
مرتا ہے تو مر جائے کوئی ان کی بلا سے

نظر پھر نہ کی اس پہ دل جس کا چھینا
محبت کا یہ بھی ہے کوئی قرینا

عشق میں جذب کیا ، اثر بھی نہیں
مر مٹے ہم انہیں خبر بھی ہیں

عشق بتاں کو جی کا جنجال کر لیا ہے
آخر یہ میں نے کیا اپنا حال کر لیا ہے

ایک طرف عاشق کی فداکاری اور بیتابی کا ناقابل دید منظر ہے اور دوسری طرف محبوب کے پتھر دل ہونے اور انتہائی بے اعتنائی برتنے کا یہ عالم، لیکن اس کے باوجود بھی عاشق کا مزاج یہ ہے کہ وہ بہر حال محبوب کو اپنا راز دل بتانے سے کچھ بھی احتیاط نہیں برتتا اور جہاں تک شکوہ سنجی کی بات ہے تو وہ کبھی اپنے ساتھ چلنے والوں کی بے دلی سے شکوہ کناں ہوتا ہے اور کبھی اپنی بے خودی سے ہی خود شکایت کرنے لگتا ہے۔

ہجوم شوق بے دل میں مگر خاموش رہتے ہیں
چھپایا تھا یہ تم سے راز ہم نے آج کہتے ہیں

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلیٔ ہمرہاں سے ہم

کچھ عرض حال کرنے نہ پائے کسی سے ہم
کس طرح شکوہ سنج نہ ہوں بیخودی سے ہم

حسرتؔ موہانی کے مطلعوں میں محبوب کی تصویر کشی، معاملات عشق کی بندش اور عاشقی کی تہذیب بھی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ یہاں ایک ایسے عاشق سے ہماری ملاقات ہوتی ہے جس کے معشوق کی خوبصورتی کا عالم یہ ہے کہ وہ جب میٹھی نیند میں ہوتا ہے، تب بھی اس کا حسن حد سے سوا اپنی طرح داری دکھاتا رہتا ہے یہ اور بات ہے کہ عاشق صادق اپنی تہذیب کا پاس ولحاظ رکھتا ہے اور وہ اپنے معشوق کی رسوائی کسی بھی صورت میں گوارا نہیں کرتا، اس لئے اپنے آپ سے بھی یہی کہتا ہے کہ ''دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا'' اور اپنی نگاہ شوق کی شکایتوں پر اسے بھی یہی سمجھاتا ہے کہ حسن خوابیدہ کو بہر حال ''سوتے میں بھی پاس سے دیکھا نہیں جاتا''۔

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرح داری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

میری نگہ شوق کا شکوہ نہیں جاتا
سوتے میں بھی وہ پاس سے دیکھا نہیں جاتا

ایک طرف تو عاشق کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے عالم کیف میں اپنا مدعا، کہنا تو کجا، خود سمجھ بھی نہیں پاتا ہے اور دوسری طرف معشوق کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اگر کبھی حرف شکایت زبان پر لاتا بھی ہے تو وہ اس کو ہنس کے ٹال دیتا ہے اور نہ صرف سنی کو اَن سنی ظاہر کرتا ہے بلکہ بظاہر سوالیہ انداز میں، مگر درحقیقت استہزائی انداز میں اس سے پوچھ بیٹھتا ہے کہ ''آپ نے یہ کیا کہا مجھے'' ۔

کیا کہوں تم سے مدعا کیا ہے
کاش میں خود ہی جانتا کیا ہے

پایا کہیں جو شکوہ گزار جفا مجھے
بولے وہ ہنس کے آپ نے یہ کیا کہا مجھے

حسرتؔ کے منقولہ مطالع غزل پر اگر ایک بار اور نگاہ ڈالی جائے تو اس بات کا بھی صاف صاف اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان میں مناسبات لفظی، تضاد و تقابل، بول چال کی زبان، مسائلت و مکالمت اور محاورے کی حسن بندش کے اوصاف بدرجہ اتم موجود ہیں۔

حسرتؔ موہانی کے مطلعوں سے قطع نظر جہاں تک ان کے غزلیہ مقطعوں کا تعلق ہے، انہیں ''گلی از گلزار'' کے مصداق ہی کیوں نہ سامنے رکھا جائے، بہرحال ان میں بھی نوع بنوع موضوعات ومضامین اور زبان و بیان کے محاسن بلا تکلف وتلاش دیکھے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس فلسفہ کا بیان دیکھئے کہ عملی اقدام ہی اصل ہے، صرف رونے سے کام نہیں چلتا، جو سنگ دل ہیں ان پر آنسو ذرا بھی اثر نہیں کرتے اور یہ کہ عشق ومحبت میں بے صبری، خام کاری کی دلیل ہوتی ہے ۔

تیری بے صبری ہے حسرتؔ خامکاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

حسرتؔ موہانی عموماً استفہامیہ طرز سے ذہن کو تحریک دیتے ہیں، یہی صورت درج بالا مقطع میں بھی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ حسرتؔ نے اپنے مقطعوں میں ایک ایسے عاشق کا کردار بھی سامنے لایا ہے جو بہر صورت محبت کی تاثیر اور پذیرائی کا یقین رکھتا ہے اور ذہنی طور سے اس مقام پر ہوتا ہے جہاں خاک عشاق کے رائیگاں جانے کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ وہ نہ صرف مقامِ نیاز پر ہوتا ہے بلکہ مقامِ ناز پر بھی ہوتا ہے اور اسے اپنی محبت پر ہمہ دم یہ اعتماد رہتا ہے کہ وہ جب چاہے گا، اپنے روٹھے پیا کو چشم زدن میں منا لے گا ۔

رائیگاں حسرتؔ نہ جائے گا مرا مشت غبار
کچھ زمیں لے جائے گی، کچھ آسماں لے جائے گا

مجھ سے بیکار وہ ظاہر میں خفا ہیں حسرتؔ
جب میں چاہوں گا، منا لوں گا یہ دعویٰ ہے مجھے

یہاں معاملہ بندی کا جو انداز ہے، جیسی حسین و پاکیزہ تصویر ہے اور جس طرح حسن تضاد کے ساتھ پوری کائنات پر عشق کی تاثیر دکھائی گئی ہے اور اس کے دائمی مستقبل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ بہرحال حسرتؔ جیسے عظیم شاعر ہی کا حصہ ہے۔

حسرتؔ نے اپنے غزلیہ مقطعوں میں کہیں عاشق کی یہ نفسیات دکھایا ہے کہ وہ ''ہوس دید'' میں یوں مبتلا رہتا ہے کہ دیدار محبوب سے اس کی کبھی سیری نہیں ہوتی اور کہیں یہ بتایا ہے کہ عشق کے تعلق سے عقل کے حصہ میں حیرانی کے سوا کچھ بھی نہیں آتا۔ محبوب جان جہاں ہے اور اس کا راز وہی سمجھ سکتا ہے جو عشق میں ''دل دیوانہ'' رکھتا ہو ۔

ہوس دید مٹی ہے نہ مٹے گی حسرتؔ
دیکھنے کے لئے چاہو انہیں جتنا دیکھو

عقل حیراں ہے، اے جانِ جہاں راز ترا
کون سمجھے دلِ دیوانہ حسرتؔ کے سوا

یہاں اگر ایک طرف ایسے عاشق سے ہماری ملاقات ہوتی ہے جو عشق میں صحرا نوردی کی راہ اپنا چکا ہے تو دوسری طرف ہم ایسے معشوق سے بھی مل سکتے ہیں جس کا شوق مٹ چکا ہے اور جو بیوفائی کا راستہ اپنا چکا ہے، لیکن عاشق صادق کی وفا سلامت ہے۔ وہ ''یک گیر ومحکم گیر'' کے مصداق محبوب کی چوکھٹ سے سر اُٹھانے اور کسی اور کی بندگی کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں، اس کے لئے واحد راستہ ''وفاداری بشرط

استواری'' کا راستہ ہے اور بہر حال وہ اسی پر گامزن ہے۔

شوق ان کا جو مٹ چکا حسرتؔ
کیا کریں ہم اگر وفا نہ کریں

حسرتؔ پھر اور جا کے کریں کس کی بندگی
اچھا جو سر اُٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

ہوا حسرتؔ مجھے پھر شوق صحرا
جنوں نے پھر مجھے سمجھا دیا کیا

حسرتؔ کے مطلعے ہوں یا مقطعے بہر صورت ان کے یہاں عاشقی کی تہذیب پوری طرح جلوہ گر ہے۔ وہ محبوب سے قریب تو ہوتے ہیں، لیکن حسن کے روبرو اظہار تمنا کی جرأت نہیں کر پاتے اور دیدار محبوب کے معاملے میں اپنے شوق فراواں کو بھی نفسیاتی عنان دینا چاہتے ہیں تا کہ حال دل افشانہ ہو، یہ اور بات ہے کہ ان کے لئے کوچہ جاناں، فردوس سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔

واللہ تجھے چھوڑ کے اے کوچہ جاناں
حسرتؔ سے تو فردوس میں جایا نہیں جاتا

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرتؔ
ان سے مل کر بھی نہ اظہار تمنا کرنا

حال کھل جائے گا بیتابی دل کا حسرتؔ
بار بار آپ انہیں شوق سے دیکھا نہ کریں

حسرتؔ کے مقطعوں میں جہاں عشق وعاشقی کے مضامین طرح طرح سے باندھے گئے ہیں اور مطلع کلام کی طرح مقطع کلام میں بھی عاشقی کے آداب کا بیان ہوا ہے اور فلسفہ و دانش کی کچھ باتیں آئی ہیں، وہیں ایک اضافی اور بہت ہی اہم پہلو یہ بھی ہے کہ حسرتؔ موہانی نے اپنے مقطعوں کو ایسے مضامین سے سجایا ہے جن میں ان کی ذاتی وخاندانی اور ادبی و سیاسی زندگی کے اہم اشارے بھی آ گئے ہیں۔ ان کا اصل نام فضل الحسن تھا، ان کا خاندان نیشاپور سے آیا تھا اور انہوں نے دہلی اور لکھنؤ دونوں ہی اسکول کے اساتذہ سے فیض پایا تھا۔ یہ ساری باتیں ان کے مقطعوں کی زبانی ہم صاف صاف سن سکتے ہیں اور ایک مزے کی بات یہ بھی ہے کہ اگر چہ انہوں نے اپنے مختلف مطلعوں میں اپنا تخلص حشو کے علاوہ صدر وابتدا اور عروض میں بلا تخصیص لایا ہے اور حلفیہ انداز، کیف مبالغت، سوالیہ انداز، تضاد وطرز تعلیق کے ساتھ اپنی بات کہی ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جن مقطعوں میں سوانحی مضمون ہے، وہاں بالعموم ان کا تخلص مقام حشو میں ہی ہے اور ان میں تنسیق تخلص کی عجیب شان بھی جلوہ گر ہے۔ انہوں نے کہیں بصورت تعلّی فارسی کے شاعر نظیریؔ نیشاپوری سے استدلالی منہاج کے ساتھ اپنا موازنہ کیا ہے اور تجنیس زائد سے کام لیتے ہوئے گویا خو کو اردو کا نظیریؔ کہنا چاہا ہے اور کہیں اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے یہاں اگر لکھنؤ کی زبان ہے تو دہلی کا رنگ بھی ہے۔

کیوں نہ ہوں اردو میں حسرتؔ ہم نظیریؔ کی نظیر
ہے تعلق ہم کو آخر خاکِ نیشاپور سے

ہے زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کا نمود
تجھ سے حسرتؔ نام روشن شاعری کا ہوگیا

غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ
طبع حسرتؔ نے اُٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

جب سے کہا عشق نے حسرتؔ مجھے
کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن

موخر الذکر مقطع میں تخلص کا ذومعنی استعال اور تعلیقی کیفیت کی بہاریں بھی دیدنی ہیں اور کلام کی سادگی میں بھی کوئی کلام نہیں۔

مختصر یہ کہ حسرتؔ کی زندگی اور شاعری جہاں اپنے اَن گنت پہلو رکھتی ہے، وہیں علی الخصوص ان کے غزلیہ مطلوں اور مقطعوں میں بھی ایسی نہ جانے کتنی ہی خوبیاں ہیں جو قاری کو بے پناہ مسرت و بصیرت سے ہم کنار کرتی ہیں۔

❁❁❁

پروین اشرفی
Raja Bazar, Patna - 800014

شوکت تھانوی: تبسمات کا فن کار

اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں شوکت تھانوی کے کارنامے، شہرہ آفاق ہیں۔ شوکت تھانوی کا اصل نام شیخ محمد عمر تھا، لیکن انہیں شہرت اپنے قلمی نام سے ہی ملی۔ وہ ۲؍فروری ۱۹۰۴ء کو بندرابن متھرا میں پیدا ہوئے اور ۴؍مئی ۱۹۶۲ء کو لاہور میں اس جہان فانی سے چل بسے۔ ''سینہ از داغ گلستاں کردم'' سے ان کا عیسوی سالِ وفات ۱۹۶۲ نکلتا ہے۔

شوکت تھانوی کے آباواجداد کا تعلق تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر سے تھا، اسی لئے وہ اپنے قلمی نام میں تھانوی لکھتے تھے۔ ان کے لئے یہ قلمی نام ان کے بہنوئی نے چنا تھا۔ شوکت تھانوی کے والد صدیق احمد بندرا بن میں کوتوال تھے۔ وہاں سے پنشن لینے کے بعد بھوپال میں ملازمت کی اور وہاں سے سبکدوشی کے بعد لکھنؤ میں مستقل بود و باش اختیار کر لیا، اس طرح شوکت تھانوی کی ابتدائی تعلیم بھوپال میں اور پھر دسویں جماعت تک کی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ وہ چرچ مشن اسکول اور حسین آباد ضلع اسکول لکھنؤ کے طالب علم رہے، مگر لکھنؤ سے میٹرک نہیں کر سکے بلکہ میٹرک کے امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی سے کامیاب ہوئے۔

شوکت تھانوی کا تاریخی نام ''تسخیر احمد'' ہے جس سے ہجری سال ۱۳۲۳ برآمد ہوتا ہے۔ اللہ نے انہیں بلا کی ذہانت دی تھی، لیکن تعلیمی سلسلہ آگے لے جانے کے مواقع انہیں کم ملے۔ والد کی وفات کے بعد معاش کی فکر نے انہیں آگھیرا۔ وہ انگریزی، فارسی اور اردو میں اچھی مہارت رکھتے تھے اور انگریزی سے بہت اچھا ترجمہ بھی کر لیتے تھے، لہٰذا انہوں نے صحافت کی دنیا میں اپنے لئے کسب معاش کی جستجو کی۔ سب سے پہلے روزنامہ ''ہمدم'' سے منسلک ہوئے، پھر روزنامہ ''اودھ'' اور روزنامہ ''حق'' میں کام کرنے لگے۔

شوکت تھانوی کا پہلا مزاحیہ مضمون ''میٹھے چاول'' ہے، جس نے ان کے لئے اخباروں میں فکاہیہ کالم نگاری کی راہ کھول دی۔ انہوں نے رسالہ ''کائنات'' کی ادارتی نیابت بھی کی اور پھر اپنی ادارت میں ''طوفان'' نامی رسالہ بھی نکالا۔ ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ کے لئے انہوں نے خاکے اور ڈرامے بھی لکھے اور تقسیم کے بعد جب پاکستان چلے گئے تو وہاں بھی انہوں نے ریڈیو سے وابستگی رکھی اور مزاحیہ فیچرز اور خاکے لکھتے رہے۔

شوکت تھانوی کی اصل شہرت کا نقطہ آغاز ان کا مزاحیہ افسانہ ''سودیشی ریل'' ہے جو ''نیرنگ خیال'' میں ۱۹۳۰ء میں چھپا تھا۔ یہ شوکت تھانوی کی جوانی کا زمانہ تھا، وہ اگرچہ سیاسی تحریکات سے براہ راست منسلک نہیں تھے، اس کے باوجود انہوں نے ''سودیشی تحریک'' سے بہرحال اثر قبول کرتے ہوئے یہ کہانی لکھی تھی اور اسے ایسی مقبولیت ملی کہ ہندی، گجراتی، مراٹھی اور بنگالی وغیرہ میں ہی اس کا ترجمہ نہیں ہوا، بلکہ اس کے انگریزی ترجمہ کی لندن میں بھی اشاعت ہوئی۔

شوکت تھانوی اپنے پلاٹ روزمرہ کی زندگی سے اخذ کرتے ہیں اور ان کے مزاح میں بیساختگی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے بالعموم کردار، گفتار اور زبان کی ناہمواریوں کو موضوع بنایا ہے اور سماجی

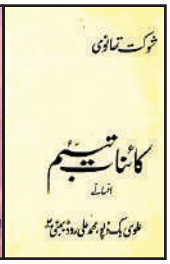

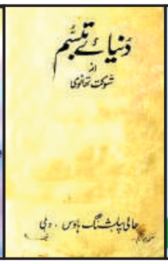

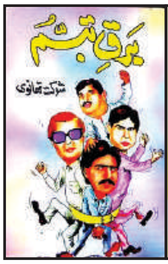

اصلاح سے بھی وہ غافل نہیں رہے ہیں جس کا ثبوت ''فلمیریا'' جیسی تحریر سے مل جاتا ہے جس کا نشانہ وہ لوگ بنائے گئے ہیں جو اُس دور میں حد سے ہوا فلم بینی کے دیوانے ہو رہے تھے۔شوکت تھانوی کی مزاحیہ تحریروں میں چاہے وسعت اور گہرائی کی کمی کیوں نہ ہو، لیکن شوخی و شرارت کی دل آویزی کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔

شوکت تھانوی کے نشری ڈراموں میں لکھنؤ کے ''منشی جی'' اور پاکستان کے ''قاضی جی'' بہت مشہور ہوئے۔شوکت تھانوی کو ''تبسمات'' کا فن کار کہا جاتا ہے جس کی خاص وجہ ''موج تبسم''، ''بحر تبسم''، ''سیلاب تبسم''، ''دنیائے تبسم''، ''برقِ تبسم'' اور ''طوفان تبسم'' جیسی ان کی سدا بہار کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ ''جوڑ توڑ''، ''نمک مرچ''، ''خانم خان''، ''بقراط''، ''بیوی''، ''داماد''، ''بارِ خاطر'' اور ''بھابھی'' وغیرہ بھی ان کی مقبول تصانیف کی فہرست میں شامل ہیں۔شوکت تھانوی کے خاکوں کا مجموعہ ''شیش محل'' کے نام سے اور ان کی خودنوشت سوانح حیات ''مابدولت'' کے نام سے اشاعت یافتہ ہے۔

شوکت تھانوی یقیناً اپنے میدان کے ایک مشہور ہی نہیں بلکہ انیک پہلو سے نہایت ہی البیلے اور اچھوتے فن کار کا نام ہے، ان کی تحریریں اصناف ادب کے لحاظ سے ایک نہیں، کئی زمروں میں آجاتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ جس زمرے میں جگہ پا لیتی ہیں، اُسے ایک نئی چمک دمک دے جاتی ہیں۔ یہ معاملہ صرف شوکت تھانوی کے ظریفانہ مضامین ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان کی خودنوشت سوانح بھی اپنے انداز میں نہایت خاصے کی چیز ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔مثال کے لئے یہ اقتباس دیکھئے:

''حسب وعدہ امین سلونوی صاحب نے 'ترچھی نظر' کا اگلا نمبر 'نظر' ہی کے عنوان سے شائع کیا اور والد صاحب نے ان کو صرف ایک 'نظر' (دیکھا) تو یہ فرمایا کہ الحمدللہ اس کا ترچھا پن تو دور ہوا، مگر باوجود الحمدللہ کے میں نے پھر کوئی غزل اس میں یا کسی اور رسالہ میں نہ چھپوائی، البتہ امین سلونوی صاحب کے بے حد اصرار پر ایک مضمون 'میٹھے چاول' کے نام سے لکھا۔ یہ میری پہلی نثری کاوش تھی اور یہ پہلا مضمون ہی مزاحیہ تھا۔ جب یہ مضمون رسالہ 'نظر' میں چھپ کر آیا تھا تو اس غزل ہی والے تیوروں کے ساتھ والد محترم نے اس کو پڑھا، مگر اس مرتبہ والدہ محترمہ کی پیشی نہیں ہوئی اور نہ اس مضمون میں کسی متحرک کو ساکن کہہ کر لاحول بھیجا گیا، بلکہ ایک عجیب وغریب منظر ایک دن یہ دکھائی دیا کہ والد صاحب وہی مضمون اپنے دوست کو بیٹھے سنا رہے تھے اور وہ دوست یہ کہہ رہے تھے کہ ان برخوردار کے اس شوق کو ختم نہ ہونے دیجئے۔ شاعری کے متعلق تو مجھ کو آپ کی رائے سے اتفاق ہے، مگر اس مضمون کے پالنے میں اس بچے کے پیر نظر آرہے ہیں۔ والد صاحب کا البتہ کچھ پتہ نہ چل سکا کہ ان کی رائے کیا تھی، مگر اپنے دوست کو یہ مضمون سنانے سے اندازہ تو یہی ہوا کہ وہ غالباً خوش ہوئے ہیں، لہٰذا نثری مضامین تو جاری رہے، شاعری کی پھر ہمت نہ ہو سکی اور جب امین سلونوی صاحب نے بہت ہی ناک میں دَم کردیا تو صاف صاف کہہ دینا پڑا کہ اوّل تو مجھے عاق ہونا نہیں ہے۔ دوسرے شعر کہنے کے لئے جس سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے اس سے میں بے بہرہ ہوں۔اللہ جانے پھر کسی متحرک حرف کو ساکن باندھ کر خود بندھ جاؤں اور بندھا ہوا مار کھاؤں۔''

یہ اقتباس قدرے طویل ضرور ہے، مگر اس سے ظرافت کی ان زیریں

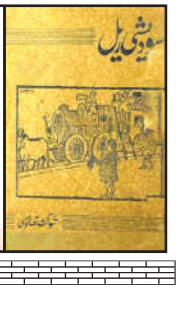

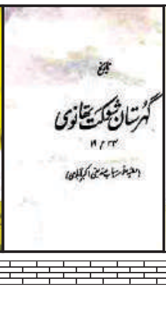

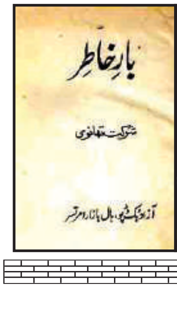

لہروں کا اندازہ لگالینا کسی کے لئے دشوار نہیں جو یہاں سرتاسر موجود ہیں، یہاں محاوروں کی مزاحیہ طرز سے تخلیقی بندرش بھی بلاتکلف دیکھی جاسکتی ہے اور پھر بات سے بات پیدا کرنے کا انداز بھی۔ یہ سوانح کا وہ حصہ ہے جس میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ اُس دور کی تہذیب اور مزاج کے اعتبار سے شاعری کی طرف رغبت کے ساتھ ہی ایک نوجوان کو اپنے والدین کے غصہ اور دھمکیوں کا کس طرح سامنا کرنا پڑتا تھا، مزید یہ کہ نثر میں لکھنے کی خاموش حوصلہ افزائی بھی اگر ہوتی تھی تو کسی سفارش ہی پر یہ مشکل ہوتی تھی۔ اصلاًادب وشاعری کی طرف آنے کے تعلق سے یہ شوکت تھانوی کی کچھ پرانی کھٹی میٹھی یادیں ہیں، لیکن ان کا تذکرہ جس طرح مزے لے لے کر انہوں نے کاغذ وقلم کے حوالہ کیا ہے، وہ انہیں کا حصہ ہے۔

شوکت تھانوی اپنے ظریفانہ مضامین میں جست بہ جست باتوں کو کہاں سے کہاں پہنچادیتے ہیں اور کتنا عبرت ناک مرقع بنادیتے ہیں، اس کا ایک نمونہ ''الیکشن کی دلچسپیاں'' میں دیکھا جاسکتا ہے، جہاں گفتگو کا آغاز تو موضوع کے مطابق ہی ہوتا ہے، مگر ذرا ہی دیر میں بات اس رُخ پر آجاتی ہے کہ:

> ''کوئی انسان خدا کو ڈھونڈے تو اس کی جستجو ایک زندگی کی ریاضت سے زیادہ قیمتی بن سکتی ہے۔ اگر یہ کوشش لارڈ بننے کے لئے کی جائے تو کم سے کم خان بہادری تو ضرور مل جائے گی۔ آخرت کے اعزاز کے لئے اس قسم کی کوشش میں خدا کے سامنے گڑگڑانا اور اس کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے اور دنیوی اعزاز کے لئے کمشنر صاحب اور گورنر صاحب کا فدوی بننا پڑتا ہے، مگر یہ (الیکشن کی امیدواری) خدا جانے کس قسم کا اعزاز ہے جو ہر نتھو، بدھو، کلو کے سامنے دنیا بھر کی ذلتیں برداشت کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے اور وہ بھی آخرت کے اعزاز کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہیں اور نہ دنیوی اعزاز کی طرح کچھ مدت کے لئے ہوتا ہے بلکہ چند سال کی بہار ہوتی ہے اور چار دن کی چاندنی۔''

اسی مضمون میں کچھ اور آگے بڑھ کر یہ سطریں بھی ملتی ہیں:

> ''کسی کا الیکشن لڑنے کے لئے لڑانے والوں کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ امیدوار کو اپنا نہایت فرماں بردار خرد سمجھ کر بغیر کسی پس و پیش کے اس کے بزرگ بن جائیں اور اپنے اشاروں پر جس طرح چاہیں اس کو نچائیں۔ یہ صورت غالباً اس لئے اختیار کی جاتی ہے کہ خود امیدوار تو ہوتا ہے مرفوع القلم اور اس کو خود اس کا احساس باقی نہیں رہتا کہ میرے جسم میں ایک چیز دماغ بھی ہے، لہٰذا اس سے ہر قسم کی بدحواسی کی توقعات ہر ایک نہایت آسانی کے ساتھ قائم کرسکتا ہے۔''

مذکورہ اقتباسات سے اصلاً یہ دکھانا مقصود ہے کہ شوکت تھانوی چاہے خودنوشت کے طور پر کچھ لکھ رہے ہوں یا کسی دوسرے موضوع پر کوئی مضمون قلم بند کررہے ہوں، بہرحال ان کے یہاں ترنگ کی ایک خاص کیفیت ہے، وہ مزاحیہ انداز میں محاوروں سے کھیلتے ہیں اور طنز وظرافت کا لہجہ ان کی تحریر میں ہمیشہ ہی شگفتہ بیانی کے جلوے دکھاتا رہتا ہے۔

شوکت تھانوی کے خاکوں کا مجموعہ ''قاعدہ بے قاعدہ'' ہو یا ''شیش محل'' یا ''نورتن'' ان سبھوں میں یہ بات مشترک ہے کہ انہوں نے بیانیہ انداز سے کام لیا ہے اور لفظوں سے مزاح پیدا کرنے میں اپنے ہنر کی کامیابی دکھایا ہے۔ ڈاکٹر صابرہ سعید نے غلط نہیں لکھا ہے کہ:

> ''شوکت تھانوی کی تحریریں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کا اولین مقصد قارئین کو ہنسانا ہے، وہ ہنسانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، الفاظ سے مزاح پیدا

کرنے کے جتنے پیرائے ہو سکتے ہیں، وہ سب شوکت
تھانوی کے پاس مل جائیں گے۔''

(اردو ادب میں خاکہ نگاری، ص ۲۳۷)

البتہ اس اقتباس پر یہ اضافہ بھی کر لیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں کہ شوکت تھانوی بہر حال موقع ملتے ہی طنز ملیح کا استعمال بھی بہت ہی چابک دستی سے کر لیتے ہیں۔ مثلاً ''قاعدہ بے قاعدہ'' میں انہوں نے مولوی عبدالحق کا خاکہ لکھتے ہوئے یہ جملہ بھی تحریر کیا ہے کہ:

''یہ ڈاکٹر بھی ہیں، مگر علاج صرف اردو کا کرتے ہیں۔''

اسی طرح ''شیش محل'' میں انہوں نے جوشؔ کے متعلق لکھا ہے کہ:

''جوشؔ صاحب کا پٹھان ہونا شاعر ہونے سے بھی زیادہ یقینی ہے۔ چنانچہ ان کے کلام میں بھی لٹھ بازی، مردانگی، جنگجوئی، خونخواریت اور غیض و غضب نظر آتا ہے جس کو لوگ انقلاب پسندی کہتے ہیں اور یہی جوش، جوشؔ کی شاعری کی روح ہے۔''

یہاں انداز چاہے کتنا ہی ظریفانہ ہو، لیکن اس سے بہر حال جوشؔ کی گھن گرج کی شاعری کا پورا منظر نامہ اپنے ساتھ طنزیہ احساس لئے ہوئے اُبھر جاتا ہے۔ غرض کہ شوکت تھانوی کی باقیات کو جس رُخ سے دیکھا جائے بہر صورت وہ اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے جو یقیناً ان کے بڑے فن کار ہونے کی روشن دلیل ہے۔

شوکت تھانوی کی تمام تر شہرت اگرچہ ان کی نثری تحریروں سے ہے، لیکن انہوں نے نہایت عمدہ شاعری بھی کی ہے جو سر تا سر طنز و ظرافت اور عصری احوال سے آراستہ ہے۔ اپنی غزلوں کا مجموعہ ''گہرستان'' کے نام سے انہوں نے خود ہی چھپوایا تھا جس کا مقدمہ جعفر علی خاں اثرؔ نے لکھا ہے۔ چند اشعار دیکھئے

نامکمل ہے ابھی وردی پولیس کی اے حضور
چوڑیوں کا بھی اضافہ اس میں ہونا چاہئے

زیست کی دشواریوں نے ہم کو یہ سمجھا دیا
جو بسر ہوجائے اس کو زندگی کہہ لیجئے

میں ہوں شوکتؔ اور مری تنہائیاں
حد نہیں ہے ان کے احسانات کی

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
شب وعدہ آ بھی جاتی تو ہمیں بخار ہوتا

اب صفائی خود ہمارا فرض ہے
الوداع اے مہترانی الوداع

❁❁❁

شوکت تھانوی کی شخصیت نگاری اور ریڈیائی ڈرامے

شخصیت نگاری میں شوکت تھانوی کا فن خوب نمایاں ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ کسی شخصیت پر لکھتے ہوئے اس کے ذرا ذرا سے پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے، شخصیت نگاری کی یہی وہ دنیا ہے جس پر شوکت تھانوی کی نظر سب سے زیادہ پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شخصی مضامین

ہمارے سامنے اصل شخصیت ہی کو لا بٹھاتے ہیں۔ ''کچھ یادیں، کچھ باتیں'' بڑے ادیبوں اور بڑے شاعروں کا ناقابل فراموش تذکرہ ہے اور پھر تحریر شوکت تھانوی کی، سونے پر سہاگہ......شوکت تھانوی نے اپنے فن کی مدد سے زیادہ سے زیادہ شہرت ریڈیو کے ذریعہ حاصل کی۔ ان کے لکھے ہوئے ڈرامے جب ریڈیو پر نشر ہوتے تھے تو بچوں سے لے کر بوڑھوں تک سبھی پورے خضوع و خشوع کے ساتھ سنتے تھے۔ ''کھی کھی'' شوکت تھانوی کے انہیں ڈراموں کا مجموعہ ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے ڈرامائی ادب میں گرانقدر اضافہ۔ (شوکت تھانوی کی کتابوں کے اشتہاری مضمون، مشمولہ ''نقوش'' لاہور، س ۱۰۱ سے اقتباس)

عطاء و شبّر

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

شبر امام کی عطاء اللہ پالوی شناسی

شبر امام توانا قلم اور تحقیقی ذہن کے مالک ہیں۔انہوں نے اپنی فکری وسعت و جامعیت سے ادب کی جہاں بینی کے ایسے جوہر دکھلائے ہیں جو فراموش شدہ ہونے کی وجہ سے اوجھل تھے۔ مذہبیات ،سوانحی خاکے اور تنقید، تحقیق ،ترتیب، ناول نگاری، افسانہ اور انشائیہ نویسی میں انہوں نے ادراک اور علمی استعداد سے کام لیتے ہوئے غور و فکر کی جہتیں ہموار کی ہیں۔شبر امام کا ایک بڑا کام عطا پالوی کی بازیافت ہے۔

عطااللہ پالوی کی شخصیت اور کارنامے پر، ان کی ذات و کائنات پر، حرف حرف آشنائی پر، تخلیقی روش پر، تنقیدی کسوٹی پر، متن کی معنویت پر، کلی شناخت کی نشانیات پر شبر امام نے چار ضخیم جلدوں میں استدلالی مواد دیا ہے۔کتاب کا نام ''عطاء اللہ پالوی: نقیب فکر و آگہی'' ہے۔پہلی جلد ۲۸۸ صفحے میں دوسری جلد ۶۰۸ صفحے میں، تیسری جلد ۵۴۴ صفحے میں اور چوتھی جلد ۵۷۶ صفحے میں ہے۔(ا) دو ہزار سے زیادہ صفحات میں تفہیم اور تجزیے کی باریک بینی ہے اور غواصی کے عمل سے گزرنے کے امتیازات ہیں۔ادبی اور سماجی موضوعات پر اور جانی پہچانی قدروں کی علمبرداری پر شبر امام نے عطااللہ پالوی کے توسط سے جیسا آئینہ اردو ادب کے سرمایے میں ضامن کے طور پر دکھلایا ہے اس سے ادبی نظریات کے کئی بت ٹوٹتے نظر آتے ہیں اور کئی نظریہ ساز کی ننگی تصویریں سامنے مجسم ہو جاتی ہیں۔

عطااللہ پالوی ۲۶ رمئی ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱ راگست ۱۹۹۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔پچاسی سال کی زندگی میں ہمہ گیر اصول کے تحت وہ معنی افشانی کرتے رہے۔ادب سے وابستگی اور مذہب اسلام بلکہ دین اسلام کے داعی رہے۔''دین'' اس لئے کہ قرآن مجید میں کسی جگہ بھی ''اسلام'' کے لئے ''مذہب'' کا لفظ نہیں آیا ہے بلکہ اسلام کو ''دین'' کہا گیا ہے۔شبر امام نے اپنی کتاب ''عطاء اللہ پالوی: نقیب فکر و آگہی'' کے دوسرے حصہ میں صفحہ ۶۱ پر وضاحت کی ہے:

> ''مذہب کا مطلب ہوتا ہے 'Religion' اور 'دین' کا مطلب ہے قانون (law) یا فیصلہ (Judgement) قرآن حکیم نے 'اسلام' کو 'مذہب' نہیں بلکہ 'دین' کہا ہے
>
> (ا) بلاشبہ اللہ کے نزدیک اسلام 'دین' ہے۔
>
> (سورۂ آل عمران۔رکوع:۲۔پارہ:۳۔آیت:۱۹)
>
> (۲) جو شخص 'دین' اسلام کے سوا، کسی اور کو طلب کرے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔
>
> (سورہ آل عمران، رکوع:۹، پارہ،۳۔آیت، ۸۵)

شبر امام کی کتاب ''عطا اللہ پالوی ،نقیب فکر و آگہی'' کی پہلی جلد میں مضامین کی ترتیب اس طرح ہے:

> (ا) معروضات (۲) پیش لفظ (۳) مرتب (۴) چراغ تلے اندھیرا (۵) میرے بزرگ (۶) وہاب اشرفی پر ایک نظر (۷) حمید اللہ پالوی (۸) عطااللہ پالوی (۹) پالوی کے مضامین (۱۰) خراج تحسین (۱۱) عطااللہ پالوی کا تنقیدی رجحان (۱۲) تصانیف عطا اللہ پالوی (۱۳) حرفِ آخر۔

اس پہلی جلد میں شبر امام نے وہاب اشرفی کی زندگی اور عمل کے منفی پہلو پر جس طرح لکھا ہے اور جیسا مواد دیا ہے، اس کا تصور تو لوگ کر سکتے ہیں، لیکن لکھنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتے ۔یہ ایک عمومی منظر نامہ ہے جس کے کثرت معنی پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔یہاں ''عورت کیا ہے؟'' پر بھی اچھا خاصا مواد ہے اور عطااللہ پالوی کے مضمون کے رد عمل میں عورت اور مرد دونوں کے ڈھیروں مراسلے ہیں۔عطااللہ پالوی کا ایک مضمون ''کمپنی کی حکومت ہندوستان میں'' ہے۔اس کے مطالعہ سے

پتہ چلتا ہے کہ رسالہ ''ادب لطیف'' کو دو ہزار روپے کی ضمانت لینی پڑی تھی:

''رسالہ 'ادب لطیف' گزشتہ چھ سال سے اردو کی خدمت میں مصروف ہے۔ اس مدت میں 'ادب لطیف' کے صفحات پر کوئی ایسی چیز شائع نہیں ہوئی جو پریس ایکٹ میں آسکے، بلکہ اس کے پیش نظر ہمیشہ اردو کی ادبی اور علمی خدمت رہی ہے اور رہے گی، لیکن 'ادب لطیف' کے مارچ نمبر میں ایک مضمون بعنوان 'کمپنی کی حکومت میری نظر میں' شائع ہوا تھا۔حکومت پنجاب نے اس مضمون کو قابل اعتراض سمجھ کر 'ادب لطیف' برانچ اور کوآپریٹیو پرنٹنگ پریس ،وطن بلڈنگ، لاہور سے (جہاں ادب لطیف چھپتا ہے) ایک ایک ہزار روپے کی رقم بطور ضمانت طلب فرمائی ہے۔ یہ رقم ۱۸ مئی تک حکومت کے خزانے میں پہنچ جانی چاہئے۔ادارہ 'ادب لطیف' رات دن روپے کی فراہمی میں کوشاں ہے۔'' (جلد اول،ص ۱۷۹)

اردو اور ہندی کا قضیہ بہت پرانا ہے۔مختلف خیال کے لوگوں کی تفصیل عطاءاللہ پالوی یوں بیان کرتے ہیں کہ اس تعلق سے اُس وقت کی سازش بےنقاب ہونے لگتی ہے:

''کئی سال کے بعد 'بھارتیہ ساہتیہ پریشد' کے اجلاس میں اردو کو مٹانے کی دوبارہ تحریک پیش ہوتے ہی 'اردو ملک' میں پھر آگ لگ گئی ہے اور ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ ہمارے قابل قدر ادبا پھر اس طرف خاص طور سے متوجہ ہوگئے ہیں، چنانچہ جہاں اور ہر طرح کی صورتیں عمل میں آئی ہیں، وہاں اس موضوع پر بے شمار مقالات بھی شائع ہوئے ہیں جنہیں دیکھ کر بہ آسانی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اس سلسلے میں چار مختلف الخیال جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں:

(۱) ایک جماعت کہتی ہے کہ 'اردو زبان' کی بقا اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کا رسم خط بدل دیا جائے اور اس کے لئے رومن رسم خط زیادہ بہتر اور آسان معلوم ہوتا ہے، لہٰذا 'اردو رسم خط' کو واصل جہنم کر کے 'رومن رسم خط' جاری ہونا چاہئے۔

(۲) ایک جماعت کہتی ہے کہ موجودہ زبان دراصل ذرا ثقیل سی واقع ہوئی ہے اور اس میں عربی فارسی کے متعلق الفاظ بہت زیادہ آگئے ہیں، لہٰذا اس میں سے وہ الفاظ حذف کر دیے جائیں۔

(۳) ایک جماعت کا خیال ہے کہ بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے جو 'زبان' اس وقت مروّج ہے، اسی زبان کو ہر ممکن طریقے سے ترقی دی جائے۔

(۴) ایک جماعت کہتی ہے کہ نہیں یہ بھی نہیں! نہ رسم خط رومن کیا جائے اور نہ عربی فارسی کے کل الفاظ نکال دیے جائیں بلکہ صرف اردو زبان کے وہ حروف ایک کر دیے جائیں جو ہم آواز ہیں، لیکن ان کے تلفظ میں کوئی فرق نہیں۔مثلاً ذ، ز،ض اور ظ، یا ث،س اور ص وغیرہ۔''

(جلد اول،ص ۲۴۵ص ۲۴۶)

عطاءاللہ پالوی معاشرہ، تہذیب، فرد اور فکر کے دوررس اثرات کی دریافت و بازیافت اور معنیاتی علمی مطالعات کی وجہ سے دور تک اپنی نشانیات اور اثر پذیری رکھتے ہیں۔ان کی ایک تصنیف ''پروین'' ہے جس کا موضوع ''عورت'' ہے۔اس میں عورت اور نغمہ کی مماثلت پر یہ انکشاف دیکھئے:

''حکمائے فارس نے 'منطقة البروج' کے بارہ برجوں کے موافق بارہ مقام موسیقی مقرر کئے ہیں اور موافق حساب ساعات شبانہ روز کے ان کے چوبیس شعبے متعین کئے ہیں، جن میں سے ہر شعبہ نغمے رکھتا ہے۔ان نغموں کی مجموعی تعداد بموجب تعداد ایام ۳۶۰ ہے۔بالکل اسی طرح ہندی ماہران موسیقی نے سمیسر مت ،بھرت مت، ہنومان مت اور کام ناتھ مت کی رُو سے نغمہ کے جتنے راگ اور سنگیت اور پھر ان کے مختلف شعبے مقرر کئے ہیں، ان کی تعداد ۳۱۶ ہے۔اگر ان دونوں اعداد کو باہم وصل کر دیجئے تو ان کی مجموعی تعداد ۶۷۶ ہوتی ہے۔یہی اعداد 'عورت' کے بھی ہیں۔ایک اس سے بھی زیادہ عجیب

مماثلت سنئے۔اگر ابجد کے حساب سے 'عورت' اور 'نغمہ' کے اعداد نکال کر دونوں کو جوڑ دیجئے تو یہ ہم عدد اور ہم شکل برابر برابر اعداد نکلیں گے۔یعنی دو 'ایک' اور دو 'سات' (۱۷۷۱) گویا اس صورت میں لفظ ہزار ہزار پردوں میں رہ کر نہ صرف 'عورت' کو دعوت حجاب ونقاب دے رہا ہے بلکہ زبان حال سے تار کر کے اوٹ اور ساز کی آڑ میں 'نغمہ' کے بھی مستور ومحبوب ہونے کی غمازی کر رہا ہے۔ بھلا اب اس سے بڑھ کر 'عورت' اور 'نغمہ' دونوں کے ایک ہونے کی اور کیا دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔'' (ج۲،ص۱۷)

عطااللہ پالوی نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ان سب پر شبر امام نے غور وفکر کیا ہے اور الگ الگ جائزہ لیا ہے۔کتاب ''انوار تفکر'' میں چار مقالے میں قرآن کی بعض آیتوں کی تفسیر سے بحث کرتے ہوئے پالوی کے روشن پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔''زبور'' اور ''توراۃ'' پر تحقیق اس طرح ہے:

''قرآن مجید میں جہاں بھی دیکھا جائے 'توراۃ' کا لفظ محض 'صحائف موسیٰ' کے لئے نہیں آیا ہے اور نہ کسی جگہ 'توراۃ' کو حضرت موسیٰ سے منسوب کر کے ان کی کتاب ظاہر کیا گیا ہے اور نہ خود موجودہ بائبل ہی میں کسی کتاب کا بھی نام 'توراۃ' ہے، بلکہ اس سے مراد 'انجیل' سے پہلے کی ان تمام کتابوں کا جو انبیائے نبی اسرائیل پر نازل ہوئی تھیں، وہ مجموعہ ہے جس کو اس وقت 'عہد عتیق' کے نام اور 'بائبل' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔اس طور پر نتیجہ یہ نکلا کہ:

(۱) 'انجیل' اور 'قرآن' حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد کی مخصوص کتابوں کا مخصوص نام ہے، جس کو 'قرآن' نے بتایا ہے اور اس طور پر انجیل اور قرآن اسم معرفہ ہے۔

(۲) 'زبور' حضرت داؤد کی کتاب کا مخصوص نام نہیں ہے۔یہ 'اسم نکرہ' ہے۔زبور کے معنی محض کتاب کے ہیں، اسی لئے قرآن میں متعدد جگہ 'زبور' کی جمع 'زُبر' آئی ہے۔

(۳) 'توراۃ' بھی حضرت موسیٰ کی 'مخصوص کتاب' کا مخصوص نام نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ان تمام کتابوں کا وہ مجموعہ ہے جو 'انجیل' سے پہلے بنی اسرائیل پر نازل ہوئی تھیں اور اس وقت 'بائبل' کے نام سے موجود ہے۔''

(جلد دوم،ص۸۱)

جلد دوم پانچ حصے میں منقسم ہے۔''مخطوطات''، ''سحر کلک'' (۲) ''چراغ تلے اندھیرا''، ''آئینہ کیوں نہ دوں''، ''چشم پوشی''، ''قصہ شاید'' کا، ''ڈاکٹر للت شباب''، ''اردو ادب میں عورت کا مقام''، ''خورشید کاکوی کے تاثرات''، ''عطااللہ پالوی کے مضامین''، ''عطااللہ پالوی ہوا کے دوش پر ''عطااللہ پالوی اور سرزمین پالوی'' اور ''خطوط'' جیسا مواد یہاں موجود ہے۔اسی جلد میں خدا بخش لائبریری میں محفوظ عطا اللہ پالوی کے چھ مخطوطات (مطالب قرآن، جلد اول، دوم، سوم تاریخ تفسیر، سحر کلک اور تذکرۂ جمیل) پر شبر امام کی تنقید ہے اور تشریح بھی۔انہوں نے عطااللہ پالوی کی تحقیق وتلاش کے کئی گوشے روشن کئے ہیں اور انکشاف کیا ہے کہ پالوی نے غیر منقوط ادب پر بھی کام کیا ہے۔انہوں نے اردو فارسی اور عربی کے غیر منقوط ادب کو جمع کیا اور اپنی رائے پیش کی ہے۔۱۰۳ صفحے کے فل اسکیپ سائز میں ''سحر کلک'' کے مخطوطہ کی فہرست بھی درج ہے:

جلد سوم میں پانچ ابواب ہیں۔باب اول کے تحت اجمالی جائزہ، پالوی اور ادب، ادبی تصانیف، چشم پوشی اور ریڈیو پر تقاریر۔باب دوم میں ''عطااللہ پالوی: سخنور دلنواز''، ''پالوی: خاک وطن''، ''پالوی: انداز تحریر''، ''ملازمتیں''، ''میں اور میرا عہد''، ''تکالیف ومصائب'' باب سوم میں ''آل انڈیا ریڈیو''، ''اہل علم ونظر کے مراسلات''، ''سید ناصر زیدی''، ''خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری'' باب چہارم میں ''کشمکش''، ''عیسائی مذہب''، ''یہودی مذہب''، ''نوجوانوں سے اپیل'' اور ''سن وفات'' اور باب پنجم میں ''سیاسی دور'' جیسے مضامین کے ذریعہ شبر امام نے نئی وسعت، نئی گہرائی اور نئے مطالب کو اُجاگر کیا ہے اور زندگی کے بیشتر نشیب وفراز پر روشنی ڈالی ہے۔

عطااللہ پالوی کی ادبی زندگی ۱۹۳۱ء سے شروع ہوئی، لیکن انہوں نے اس کا التزام رکھا کہ وہ ادبی شخصیتوں سے نہ ملیں اور کسی رسالے میں اپنی تصویر نہ چھپوائیں۔انہوں نے خود لکھا ہے:

''میں نے ایڈیٹروں کے اصرار کے باوجود کبھی کسی

رسالہ میں اپنی تصویر نہیں چھپوائی ۔ ایک مرتبہ رسالہ ’شاہکار‘ (گورکھپور) نے یہ التزام کیا کہ وہ اپنے عہد کے تمام مشہور ادیبوں اور شاعروں کی تصویر شائع کرے، چنانچہ اس نے مجھے بھی کئی بار لکھا، مگر میں نے اس کے کسی خط کا جواب نہیں دیا اور جب وہ نمبر شائع ہوا تو میں نے دیکھا کہ واقعی اس عہد کے تمام زندہ اہل قلم حضرات کی تصویریں اس میں تھیں، سوائے عبدالماجد دریابادی اور میرے۔‘‘ (جلد سوم، ص۲۶)

جوشؔ ملیح آبادی اور اور خصوصی طور پر پروفیسر عندلیبؔ شادانی کے تعلق سے عطاءاللہ پالوی کی تحریر دیکھئے:

’’جوشؔ ملیح آبادی سے میری مراسلت کافی تھی۔ ان کے رسالہ ’کلیم‘ میں میرے متعدد مضامین شائع ہوئے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پٹنہ آئے تو انہوں نے مجھ سے ملنے کی کوشش کی، مگر میں نہ ملا۔ دو مرتبہ عندلیبؔ شادانی آئے۔ سینٹ ہاؤس میں مشاعرہ تھا۔ پہلی مرتبہ میں مشاعرہ میں گیا اور ان کا کلام سنا، مگر ملا نہیں۔ عندلیب شادانی شعر تو اپنے نام سے کہتے اور چھپواتے تھے، لیکن افسانے ’پریم پجاری‘ کے نام سے لکھتے تھے اور یہ افسانے صرف ’ساقی‘ (دہلی) میں چھپتے تھے۔ لوگ ’ساقی‘ سے پوچھتے تھے کہ یہ کون صاحب ہیں؟ مگر وہ بتاتا نہ تھا۔ کچھ کلام ان کا ’پریم پجاری‘ کے نام سے بھی شائع ہوا تھا۔ میں جب مشاعرہ میں گیا تو ان کو وہ کلام بھی پڑھتے سناتے دیکھا جو ’پریم پجاری‘ کے نام سے ’ساقی‘ میں چھپا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ ’پریم پجاری‘ یہی ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیبؔ شادانی ہیں۔‘‘ (ایضاً)

عطاءاللہ پالوی کی تحریر میں ’’انکشاف‘‘ بہت ملتا ہے۔ جدید ترین اور کلاسیکی زبان و ادب، فنون لطیفہ وصحافت، مذہب وسیاست اور معیشت و معاشرت پر ان کے اظہار میں جہاں لسانی، فلسفیانہ اور اصلاحی افہام وتفہیم ہے، وہیں تشریح وتفسیر بھی ہے، جس سے لفظ ومعنی کی عصری ساختیات سے دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ ایک فنکار مالی منفعت کو ثانوی درجہ دیتا ہے اور فن شناس تحسین کو پہلا مرتبہ سمجھتا ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھئے:

’’عبدالرحیم خانخاناں کے دربار میں ایک مصور حاضر ہوا اور اس نے ایک تصویر ان کے حضور میں پیش کی۔ تصویر یہ تھی کہ ایک حسینہ غسل کر کے ایک کرسی پر بیٹھی اپنے سر کو ایک طرف جھکائے سر کے بال پھٹکار رہی تھی۔ اس کی خادمہ اس حسینہ کا پاؤں دھوتے ہوئے اس کے تلوے میں جھاما (یا جھانوا) کر رہی تھی۔ خانخاناں نے اس تصویر کو کچھ دیر غور سے دیکھا اور پھر اپنے معزز درباریوں کی طرف بڑھا دیا۔ اہل دربار نے اس تصویر کو باری باری سے دیکھا، مگر انہیں ایسی معمولی سی تصویر میں کوئی قدرت یا فنکاری نظر نہیں آئی۔ سبھوں کے ملاحظہ کے بعد جب تصویر دوبارہ خانخاناں کے پاس واپس آئی تو انہوں نے اپنے خزانچی سے کہا کہ مصور کو پانچ ہزار روپے دیے جائیں۔ انعام کی رقم آنے سے پہلے مصور نے دست بستہ خانخاناں سے عرض کیا کہ والاحضرت نے اس میں میرا کمال کیا ملاحظہ فرمایا؟ میں نے یہ تصویر اور امرا کے درباروں میں بھی پیش کی تھی اور ان درباروں میں سے کئی امیر نے اس سے بھی زیادہ صلہ دینے کا حکم دیا تھا، مگر میں نے اس صلہ کو قبول نہیں کیا تھا، اس لئے کہ میرے کمال کی مجھے داد نہ ملتی تھی۔ خانخاناں کے درباری پانچ ہزار انعام کو بھی خانخاناں کی محض فیاضی پر محمول کر رہے تھے کیوں کہ اس تصویر میں انہیں کوئی خاص خوبی نظر نہیں آئی تھی۔ بس ایک معمولی تصویر تھی۔ خانخاناں نے مسکرا کر فرمایا کہ تصویر میں جو حسینہ کرسی نشیں ہے، ملازمہ کے جھاما کرنے سے اس کے تلووں میں گدگدی ہو رہی ہے جس کو تم نے اس کے چہرے پر نمایاں کیا ہے۔ مصور جوش عقیدت اور فرط مسرت سے بے قابو ہو گیا اور کہا، میں نے انعام پالیا۔‘‘ (جلد سوم، ص۴۷)

جلد چہارم میں چار ابواب ہیں۔ باب اول کے عنوانات ہیں:
''عطااللہ پالوی: احوال وآثار''، ''پالوی کی حقیقت نگاری''، ''علی نگر پالی اور ماحول''، ''پالوی کی ابتدائی تحریر''، ''پالوی اور انحراف''، ''ادب میں دانشوری''، ''پالوی کا پہلا تنقیدی ادبی تحفہ''، ''عورتوں پر پابندیاں''، ''پالوی کا دوسرا تنقیدی ادبی تحفہ''، ''قران السعدین: پالوی''، ''فن اور انداز نقد''، ''غالبؔ اور مومنؔ پر میری نظر''

باب دوم میں بارہ مضامین ہیں:
''ناقد بنام ناقد''، ''عندلیبؔ شادانی وجگرؔ مرادآبادی'' (اول ودوم) ''میر انیسؔ اور فردوسیؔ پر مرزا صاحب کی رائے''، ''نقد برنقد''، ''اقبالؔ اور ثاقبؔ: مادر مشفقہ کی یاد میں''، ''بال جبریل پر دونظر''، ''ایک ادبی ڈائری کے دو ورق''، ''جلیلؔ لکھنوی: زمزمہ پردازیاں''، ''ناطق: جام باقی''، ''جناب عطااللہ پالوی کی ادبی چوکیداری''

باب سوم میں مضامین کے عنوان یوں ہیں:
''اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ''، ''آشیرواد: آمنہ ابوالحسن''، ''کلام اقبالؔ کی تدوین: رشید حسن خاں''، ''پالویؔ کے تنقیدی واصلاحی ادبی معرکے''، ''جرم اور سزا بہار اور بہاریت''، ''خط: شباہت حسین، علی گڑھ''، ''نکہت گل'' اور ''سحر نظم''، ''پالوی ایک مثالی ہندوستانی''

باب چہارم میں چودہ مضامین ہیں:
''پالوی کا مطلوب ومقصود''، ''مولانا آزاد کی بغاوت''، ''آزاد اور پالوی''، ''پالوی کی نثر نگاری کا نمونہ''، ''شرح ومنہاج''، ''مولانا آزاد کی خوشحالی اور پالوی کی بدحالی''، ''دعا کی بے اثری''، ''حجر اسود''، ''شامت عظیمت''، ''پالوی کے تنقیدی مضامین''، ''عورت گہوارۂ تنقید میں''، ''عورت تنقید کے شکنجے میں''، ''عورت کشمکش بحث میں''

عطااللہ پالوی کی اپنی فکر تھی، اپنی تلاش وتحقیق تھی اور احساس ونظر کی اپنی گہرائی تھی۔ فاضلانہ مباحث اور بصیرت کی صداقت کی وجہ سے وہ صحیح معنوں میں دانشور تھے۔ شبر امام نے بھی اعتراف کیا ہے:

''پالوی اردو ادب کے دانشوروں میں ایک دانشور تھے۔ آج اردو ادب میں دانشوری کا لفظ اس کثرت سے استعمال ہو رہا ہے کہ ہر لکھنے پڑھنے اور رسالہ نویس کو بے دھڑک دانشور کہا جاتا ہے۔ دانشور صحیح معنوں میں ایک فلسفی، مفکر، تحقیق وتخلیق کار ہی کو کہا جاسکتا ہے جس کا ایک خاص نظریہ، ایک خاص مقصد، تعمیری نظام زندگی ہو، جو ایک ترتیب وتنظیم کے ساتھ انسانیت کو فروغ دیتا ہو۔'' (جلد چہارم، ص ۷۵)

عطا اللہ پالوی کی دانشوری ان کی تنقید میں الگ انداز سے اجاگر ہوتی ہے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی پر ان کی تنقید ملاحظہ کیجئے:

''جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی صاحب نے ۱۹۳۰ء کے بعد سے جو صحافتی ترقی کی ہے، وہ محتاج بیان نہیں اور یہ بھی بلاغور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اتنی کم مدت میں اتنی زیادہ شہرت حاصل ہو جانا چغتائی صاحب ہی کی قسمت میں تھا، مگر افسوس اس کا ہے کہ اس شہرت سے مرزا صاحب اس درجہ متاثر ہوئے ہیں کہ اب بجائے 'مزاحی افسانوں' کے 'ناول نویسی'، 'حمایت ہندی' اور 'تنقید نگاری' پر قلم فرسائی کرنے لگے ہیں اور ہمیں مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ آخر الذکر دونوں عنوانات پر جو کچھ آپ نے اب تک کہا ہے، وہ 'قابل توجہ' نہیں، ایسی صورت میں ایسے مشہور ومعروف مصنف اور صحافتی آسمان کے ایک درخشندہ ستارے کے لئے اس کے مضمون کا 'توجہ طلب' نہ ہونا، کس قدر افسوس کن اور حوصلہ شکن ہے۔'' (ج ۴، ص ۲۰۰)

اردو مرثیہ نگاری میں میر انیسؔ جس مقام پر ہیں، اس رنگ اور التزام تک کسی کی رسائی نہیں ہوسکی۔ ان کی رزمیہ شاعری میں زور کلام ہے، مضمون کی بندش ہے، شوکت الفاظ ہے، جداگانہ اسلوب نگارش ہے اور صحیح وتاریخی حقیقت نگاری ہے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی نے ۱۹۳۸ء میں میر انیسؔ کی رزمیہ شاعری کے بارے میں لکھا:

''شاہنامہ پڑھنے کے بعد اگر میر انیسؔ کا رزمیہ کلام پڑھو تو ممکن ہے کہ شبہ ہو کہ میر انیسؔ نے طرز بیان وغیرہ شاہنامہ سے لیا ہے، لیکن نہیں، مجھے تو کم از کم یہ خیال گزرا کہ میر انیسؔ کی رزمیہ شاعری کہیں ایسا تو نہیں کہ سرے طبع زاد ہی نہیں بلکہ فردوسی کے شاہنامہ کا اردو چربہ ہے۔ چربہ بھی انہیں، بلکہ ترجمہ اور جو شہرت میر انیسؔ کو اس سلسلے میں حاصل ہوئی، اس کے وہ کسی طرح مستحق نہ تھے۔ گویا بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی حیثیت ایک مترجم سے زائد نہ تھی۔''

اس کا جواب جولائی ۱۹۳۸ء کے ''کلیم'' میں عطا اللہ پالوی نے اس طرح دیا:

''یہ ہیں مرزا صاحب کے زریں خیالات۔ میر انیسؔ کی رزمیہ شاعری کے متعلق کیا یہ الفاظ اور جملے پر از تعصب نہیں؟ بہر کیف! اگر مرزا صاحب اپنے اس بیان کی تصدیق میں قلم اُٹھائیں اور 'موازنہ' فرمائیں تو انہیں غالباً بڑی مایوسی ہوگی۔ البتہ کہیں کہیں اسلوب بیان میں یگانگت ملے گی، تو یہ تعجب کی بات تو نہیں اور نہ اس یگانگت پر کسی معنی سے اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ اصل شاعر وہی ہے جو فطرتاً شاعر واقع ہوا ہے اور فطرت ہر ذی روح کے ساتھ منسلک ہے، پھر اگر شعر میں 'اشتراک فطری' پایا جاتا ہے تو گناہ کیا ہے؟ بہت سے شعرا کے کلام میں 'یگانگت' پائی جاتی ہے اور ملے گی، مگر اس کو 'سرقہ' (مرزا صاحب نے غالباً اخفائے تعصب کی کوشش میں 'سرقہ' کو 'چربہ' لکھا ہے) نہیں کہا جا سکتا اور اس موضوع پر نکتہ چینی محض تعصب اور 'دریدہ دہنی' میں شمار ہوگی۔'' (جلد چہارم، ص۲۰۱)

مثنوی کی بحر کے بارے میں عطا اللہ پالوی نے بہت سے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اپنی رائے قائم کی ہے۔ عام طور پر شعرا مانتے رہے ہیں کہ مثنوی کے لئے وہی آٹھ بحریں محدود سمجھی جاتی ہیں جن میں فارسی زبان کی مثنویاں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں عطاء اللہ پالوی ضروری تفصیلوں کے ساتھ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''مگر ایسا سمجھنا کوئی معنی نہیں رکھتا جس بحر میں شاعر چاہے 'مثنوی' کہہ سکتا ہے۔ فارسی زبان میں جن آٹھ بحور میں مثنویاں پائی جاتی ہیں، وہ یہ ہیں: (۱) بحر رمل مسدس مخبون یا محذوف: جس کا وزن ہے: فاعلاتن، فاعلات (۲) بحر مسدس مخبون یا محذوف: جس کا وزن ہے: فاعلاتن، فعلاتن، فعلن (۳) بحر خفیف مسدس مخبون مقطوع یا محذوف، جس کا وزن ہے، مفاعلن فعلن (۴) بحر سریع مسدس مطوی موقوف، جس کا وزن ہے، مفتعلن، مفتعلن، فاعلاتن (۵) بحر ہزج مسدس محذوف: جس کا وزن ہے، مفاعیلن، مفاعیلن، فعولن (۶) بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض، محذوف، جس کا وزن ہے، فعول، مفاعیلن، فعلن (۷) بحر متقارب مثمن مقبوض، جس کا وزن ہے، فعولن، فعولن، فعولن، فعول (۸) بحر متقارب مثمن مقبوض جس کے بتیس (۳۲) اوزان ایسے ہیں جو بہ ادنیٰ تغیر، اس بحر کے ساتھ مل کر آتے ہیں۔ ان فارسی کی آٹھ بحروں میں سے بعض بحریں اردو میں قطعاً مقبول نہیں ہوئیں اور ان بحروں میں کوئی اردو مثنوی نہیں پائی جاتی۔ مثلاً چوتھی اور پانچویں اور بعض بحر بہت زیادہ مقبول ہوئی اور اس میں بہت سی مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً تیسری۔''

(جلد چہارم، ص۴۰۳، ۴۰۲)

شبر امام نے عطا اللہ پالوی کو بھرپور طور پر تلاش کر کے ان کے پرت در پرت پہلو کو اُجاگر کر کے اور ان کی تخلیقات پر روشنی ڈال کر اردو کے سرمایے میں اضافہ کیا ہے۔

(۱) شبر امام کی کتاب ''عطاء اللہ پالوی: نقیب فکر و آگہی'' کی مزید کئی جلدیں بھی اشاعت یافتہ ہیں

(۲) ''سحر کلک'' غیر منقوط شعری اور نثری متن پر مشتمل ہے عطاء اللہ پالوی کی یہ مرتبہ کتاب شبر امام کے مقدمہ کے ساتھ اشاعت پا چکی ہے

ایم۔احمد توصیف
Bairia, P.o. Kolhua, Paighambarpur, Yahiyapur, Kanti - 843113

پالی کے دو رتن: عطاء اللہ اور شبر امام

عطااللہ پالوی اور شبر امام ـــــــ نام ہے پالی کے دو ادبی رتن کا، جو بیسویں صدی میں بہار کی اس مردم خیز بستی سے اُٹھے اور علم و ادب کی گرانمایہ خدمتیں انجام دے کر گزشتہ صدی کے سال اواخر میں اور رواں صدی کے گزشتہ سال میں آخرت کے سفر پر چلے گئے۔

ان دونوں ارباب قلم میں اگر چہ عمر کے لحاظ سے لگ بھگ پچیس سال کا فرق تھا، لیکن افکار و نظریات، ان کے طریق اظہار اور تصنیفاتی مشاغل سے تن دہی کے ساتھ وابستگی کا جہاں تک تعلق ہے، ان دونوں ہم وطن ادیبوں میں، جنہیں فنافی المطالعہ اور فنافی التحریر رہنا مرغوب و مطبوع تھا شاید کہ بہت زیادہ فرق کی تلاش مشکل ہے، البتہ اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ یہ دونوں ہی اہل قلم متداول معنوں میں چاہے بڑی بڑی جامعاتی ڈگریاں رکھنے والے نہ ہوں، مگر بہترین ادبی و علمی اور فکری صلاحیتوں کے مالک ضرور تھے۔ ان کا مطالعہ و مشاہدہ وسیع تھا اور جزوی اختلاف کے باوجود بہرصورت ان کی سوچ کے منطقی وزن و وقار سے بھی یکسر انکار آسان نہیں۔

عطاء اللہ پالوی کا زمانہ حیات مئی ۱۹۱۳ء سے اگست ۱۹۹۸ء تک اور شبر امام کا زمانہ حیات نومبر ۱۹۳۹ء سے مئی ۲۰۲۴ء تک ہے۔ عطاء اللہ پالوی تاریخی، ادبی، سماجی اور مذہبی موضوعات پر مسلسل لکھنے والے قلم کار تھے، خصوصاً ''قرآنیات'' کے موضوع سے وہ بیش از بیش شغف رکھتے تھے۔ ''انگبین'' (۱۹۴۲ء) ''پروین'' (۱۹۴۴ء) ''تذکرۂ شوق'' (۱۹۵۶ء) ''مثنویات شوق'' (۱۹۷۵ء) ''اردو کے ہندو مثنوی نگار'' (۱۹۸۲ء) ''گلہائے پژمردہ'' (۱۹۸۴ء) کے علاوہ ادبی مقالات کے مجموعے ''احمرین'' اور ''عنبرین'' اُن سے یادگار ہیں، مزید برآں ''سوانح سر سلطان احمد'' (۱۹۶۳ء) سے لے کر ''مشاطگان ادب'' (۱۹۸۶ء) تک ان کی متعدد سوانحی اور تاریخی تصنیفات اور ان کے دیگر مخطوطات کا ذکر بھی اُن کے سوانح نگاروں کی تحریروں میں جگہ جگہ اور بار بار ملتا ہے۔

عطاء اللہ پالوی کی علمی و ادبی شخصیت اور ان کے کارناموں کو زمانے سے متعارف کرانے والے ادیب شہیر کا نام شبر امام ہے۔ وہ ان کے نظریوں اور ان کی علمی خدمتوں سے بے حد متاثر تھے۔ شبر امام کی تصنیفی زندگی کا آغاز ''مآل تفکر'' کے ساتھ ۱۹۹۱ء سے ہوا اور سال گزشتہ (۱۹۲۴ء) وہ اپنی کتاب ''تذکرہ و تبصرہ'' پریس کے حوالے کرنا ہی چاہتے تھے کہ ان کا وقت موعود آپہنچا:

> ''شبر امام کو بلاشبہ قدرت نے تحریکی و تعمیری اور اصلاحی ذہن بخشا تھا۔ وہ عنفوان شباب سے ہی سماجی ناہمواریوں کے خلاف سینہ سپر رہے اور مختلف نوعیت کی فلاحی و رفاہی تحریکوں میں حصہ لیا۔ سیاسیات و سماجیات اور اردو تحریک سے بھی خاص انداز میں ان کی وابستگی رہی۔ ان مقاصد کے لئے انہوں نے 'ادارہ حسینی سماج' کا قیام عمل میں لایا اور جب تک جسمانی قویٰ ساتھ دیتا رہا، وہ پورے زور و شور سے عملاً کام کرتے رہے۔ وہ ایک

حقیقت پسند آدمی تھے اور وہ تاریخ تہذیب کے ایک مستند قلم کار۔'' (چند جملوں میں حال کے صیغے کو ماضی سے بدلتے ہوئے، شبر امام کی کتاب ''ایک جہاں اپنا بھی'' مطبوعہ ۲۰۱۸ء کے پس ورق سے ماخوذ)

شبر امام سے جہاں ایک طرف متعدد مرتبہ کتابیں یادگار ہیں اور ''بہار کا میر امن: دیانت شیخ پوروی'' (۱۴-۲۰۱۳ء) لکھ کر انہوں نے ایک تحقیقی کام پورا کیا ہے، وہیں ناول نگاری میں ''شاہین'' (۱۹۹۶ء) اور ''جب گاؤں جاگے'' (۲۰۰۵ء) سے اور انشائیہ نگاری، افسانہ نگاری اور سوانحی خاکہ نگاری میں ''شاخِ بریدہ'' (۲۰۱۵ء) ''تلاش'' (۲۰۱۷ء) اور ''تلخیاں'' (۱۹۹۵ء) سے اپنی جگہ بنائی ہے۔

اتنا ہی نہیں تاریخ نویسی میں ''میری بستی، میرے لوگ'' (۲۰۱۹ء) اور ''احسن خاندان اور علی نگر پالی'' (۲۰۱۲ء) سے ان کے مطالعہ اور محنت اور تلاش و تفحص کی گواہی ملتی ہے اور تنقید و تحقیق کے تعلق سے ان کی مرتبہ کتاب ''فسانہ ہمت'' (۲۰۲۰ء) کا مقدمہ بھی متوجہ کرتا ہے۔ شبر امام کی یہ ساری خدمتیں اپنی جگہ، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان کی کتاب ''عطاء اللہ پالوی: نقیب فکر وآگہی'' ان سبھوں پر ایک خاص نہج سے فوقیت رکھتی ہے۔

اس کتاب کی پہلی جلد ۲۰۰۸ء میں چھپی تھی اور آخری جلد ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب سے بلاشبہ شبر امام نے عطاء اللہ شناسی کا بہترین حق ادا کیا ہے اور صرف اتنا ہی نہیں کہ گویا عطاء اللہ پالوی کو جہانِ علم وادب میں زندہ کردیا ہے بلکہ اسی کی بدولت بجا طور پر خود انہوں نے بھی ''ماہر پالویات'' کا درجہ پایا ہے۔ عطاء اللہ پالوی پر شبر امام کی اس کتاب کا اشاعتی سلسلہ چونکہ کئی برسوں پر محیط ہے، اس لئے بسا اوقات ناقدین و مبصرین کی تحریروں میں اس کی صرف ابتدائی جلدوں ہی کا تذکرہ ہوسکا ہے۔

اسی طرح عطاء اللہ پالوی کی بعض کتابیں مثلاً ''سحر کلک'' وغیرہ شبر امام کی علمی توجہ سے ذرا بعد کے زمانے میں چھپی ہیں اس لئے ان کا ذکر بھی بسا اوقات مخطوطات کے طور پر ہی کردیا جاتا ہے۔ بہرصورت ان ضمنی پہلوؤں سے صرف کرتے ہوئے بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ سرزمین پالی کے یہ دونوں ادبی رتن اپنے نوع بہ نوع تصنیفی کارناموں کی بدولت کبھی بھلائے نہیں جاسکتے۔ خصوصاً مئی کا مہینہ ان دونوں کی یاد اس طرح لے آتا ہے کہ یہی مہینہ عطاء اللہ پالوی کا ماہ ولادت ہے اور یہی مہینہ شبر امام کا ماہ وفات۔

عطاءاللہ پالوی کی علمی اور ادبی خدمات پر شبر امام نے جو تصنیفی کام کیا ہے، اس کی روشنی میں انہیں تحسین نگار اور تحقیق نگار دونوں ہی کہا جاسکتا ہے۔ وہ چونکہ پالوی صاحب کے غایت درجہ مداح و معتقد ہیں اور ان کے افکار سے انتہائی متاثر، اس لئے پالوی صاحب پر ان کے کاموں میں حسن عقیدت کی جھلکیاں ملنی باعث حیرت نہیں بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اپنے عقیدتمندانہ جذبات کے ہالے میں رہتے ہوئے بھی انہوں نے اپنی تحقیقی کاوشوں اور محنتوں کو کہیں نہ تو اپنی تساہلی سے شرمندہ کیا ہے اور نہ ہی کہیں اپنے تاثرات کو زبردستی قاری کے سر تھوپنے کی کوشش کی ہے بلکہ افہام و تفہیم کا راستہ اپنایا ہے اور معروضی انداز کے ساتھ بسا اوقات استفہامی و تقابلی طرز سے بھی برجستہ کام لیا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ شبر امام کے تحقیقی کاموں میں بلاغت کی یوں کمی آگئی ہے اور مانعیت بایں معنی مجروح ہوئی ہے کہ انہوں نے بہت ساری غیر متعلقہ باتیں بھی تحریر کے دوران سمیٹ لی ہیں اور اسی کے ساتھ تکرار پیہم اور شکوہ سنجی کی وہ کیفیت بھی ان کی تحریروں میں در آئی ہے جو طرز پیش کش اور طریق تسلسل کو صدمہ پہنچاتی ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہنا چاہئے کہ ''عطاء اللہ پالوی: نقیب فکر وآگہی'' کے نام سے انہوں نے سخت محنت اور کاوش سے کام لیتے ہوئے سات

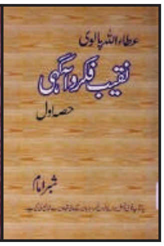

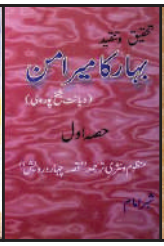

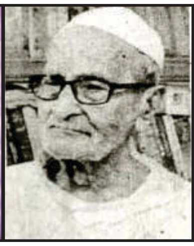
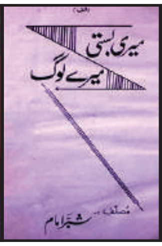

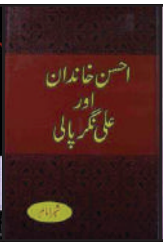

جلدوں پر مشتمل جو کتاب ہمیں دی ہے وہ ایک اسم با مسمیٰ کتاب ہے جو اُن کے ممدوح کو بہر حال فکرو آ گہی اور دانشوری کے نقیب کی حیثیت سے ہمارے روبرو لا دینے میں پوری طرح کامیاب ہے۔

اس کتاب کی پہلی جلد میں جہاں عطاء اللہ پالوی کے احوال و اوصاف، ان کے متعدد مضامین، ان کے تنقیدی رجحان اور ان کی تصنیفات پر قیمتی مواد مہیا کیا گیا ہے اور بعض متعلقہ گوشہ پر بحث وتمحیص اور فکری تجزیہ کاری کی راہ اپنائی گئی ہے، وہیں اس کی دوسری جلد میں پالوی صاحب کے ''سحر کلک'' وغیرہ جیسے مخطوطات اور ان کے ریڈیائی مضامین کا ذکر آیا ہے اور ان کے متون یکجا کئے گئے ہیں۔

جب کہ شبر امام کی اس کتاب کی تیسری جلد میں عطاء اللہ پالوی کے عہد و ماحول، ان کے وطن، ان کے مشاغل اور ان کے مذہبی و سیاسی اور سماجی عقائد پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز کب سے اور کس انداز سے ہوا۔

شبر امام کی کتاب ''عطاء اللہ پالوی: نقیب فکرو آ گہی'' کی چوتھی جلد میں بھی اسی نوعیت کے معلوماتی مواد کا پھیلاؤ ہوا ہے اور ان کی ابتدائی تحریر اور پہلی اور دوسری ادبی تنقیدی تحریر کے بارے میں بتایا گیا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس جلد میں ''ناقد بہ نام ناقد''، ''نقد بر نقد'' کے ضمنی عنوان کے ساتھ قیمتی معلومات سے نوازا گیا ہے اور ''پالوی کے تنقیدی و اصلاحی ادبی معرکے'' اور ''آزاد اور پالوی: ایک جائزہ'' کی سرخیوں کے ساتھ بھی بہت ساری انکشاف بداماں اور اہم باتیں سمیٹی گئی ہیں۔ اس طرح مذکورہ چار ابتدائی جلدوں کا مطالعہ جناب پالوی کی شخصی اور ادبی زندگی کے بہت سارے پہلو روشنی میں لا دیتا ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ کسی موضوع پر تحقیقی مراحل سے گزرنے والوں میں، اپنی کامیابی کے بعد ایک خاص قسم کی نفسیات پیدا ہوتی ہے اور وہ از روئے نقد اپنے تلاش کردہ مواد کے تفوق کا احساس دلانا چاہتے ہیں اور جیسا کہ اشارہ ہو چکا، جناب پالوی پر شبر امام کی زیر تذکرہ کتاب سے بھی ایسی کیفیت بسا اوقات جھلکنے لگتی ہے، لیکن اس سے قطع نظر یہ ایک بات نہیں بڑی بات ہے کہ جناب پالوی کو شبر امام جیسا تحقیقی محنت و مزاج اور نظر و نظریہ رکھنے والا فن کار ملا، جس نے ''عطاء اللہ پالوی: نقیب فکرو آ گہی'' کو جدول بہ جدول دیکھنے اور دکھانے میں پورے خلوص اور پوری مستعدی سے اپنا وقت عزیز صرف کیا اور صرف ابتدائی چار جلدوں تک ہی اپنے کام کو محدود نہیں کیا، بلکہ یکے بعد دیگرے اس کتاب کی مزید تین جلدیں بھی شائع کیں۔

چوتھی جلد کے بعد، پانچویں جلد میں اصلاً پالوی کی تحقیقی تصنیف ''تذکرۂ شوقؔ'' کے مواد کی یکجائی اور اس پر تجزیاتی اظہار خیال کو گفتگو کا مرکز و محور بنایا گیا ہے اور بر سبیل تذکرہ جناب پالوی کو بحیثیت شاعر بھی سامنے لایا گیا ہے۔ اردو مثنویات اور خصوصاً نواب مرزا شوقؔ کی مثنوی پر شبر امام نے اپنی کتاب کی اس پانچویں جلد میں جو مواد مہیا کیا ہے وہ ''پالویات''، ''شوقیات'' اور ''مثنویات'' تینوں ہی پہلو سے نہایت اہم علمی و تنقیدی مواد کہلانے کا حقدار ہے اور اس کے تحقیقی مرتبہ میں بھی کوئی شک نہیں۔

''عطاء اللہ پالوی: نقیب وفکرو آ گہی'' کی چھٹی جلد میں بھی اگر چہ ''مثنویات شوقؔ اور عطاء اللہ پالوی'' کی باتیں ہوئی ہیں، لیکن یہ جلد درحقیقت عطاء اللہ پالوی کو ایک مذہبی مضمون نگار کی حیثیت سے سامنے لاتی ہے اور ان کی قرآن فہمی کے اختصاصی پہلو، تقابل تراجم کے ساتھ عیاں کر دیتی ہے، جب کہ اس کتاب کی ساتویں جلد میں بھی متنوع موضوعات پر تحریریں یکجا کر دی گئی ہیں جن کی نوعیت مذہبی مضامین کی ہے اور اس طرح مجموعی لحاظ سے یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ شبر امام نے اپنی کتاب کی سات جلدوں کے روپ میں گویا عطاء اللہ شناسی کا تحقیقی ہفت خواں نہایت کامیابی سے طے کیا ہے۔ ❁❁

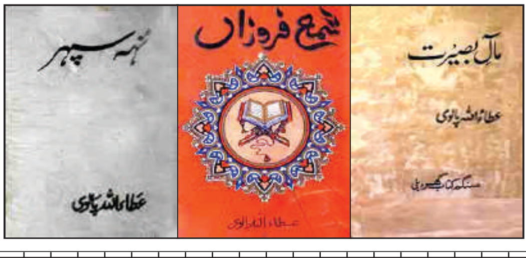

پرویزؔ و انجمؔ

ڈاکٹر سید اشہد کریم
Sardar Vallabh Bhai Patel College, Kaimur, Bhabhua - 821101
(Mob. 9616730727)

پرویزؔ شاہدی کی غزل گوئی

روایتی اردو غزل کا پیٹرن بدلنے میں ترقی پسند تحریک نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔ یہاں پیٹرن سے میری مراد اردو غزل کے اندر اس مریضانہ عشق کا تصور ہے جو کبھی دبستان لکھنؤ کی غزلیہ شاعری میں عیش پرستی کے رکیک سطحی اور کچے تجربے کی خمیر سے اٹھتے ہوئے جذبات تھے، حالانکہ سفلی اُبال کھاتے ہوئے جذبات کی اس ترجمانی کے نمونے دبستان دکن اور دبستان دہلی سے بھی کچھ کچھ حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ غزل کی یہ سہل پسندی معاشرے کی اس عام روش کو اپنے دامن میں جگہ دینے سے نہ روک سکی۔ لکھنؤ جب ریختہ کے مقابلے ریختی کی دوڑ لگا رہا تھا تو اس وقت وہاں طوائف بازی، رندی، ہوسناکی اور ہر قسم کی لذت پرستی کو خاصی ترقی ہوئی۔ عشقیہ شاعری اپنی پرانی روش سے ہٹ کر محبت کے نئے رنگ میں ڈھل گئی اور چھیڑ چھاڑ، چوما چاٹی، ہاتھا پائی کا نام ہی محبت ہوگیا۔ جسم و جان کی رنگینیوں اور ہوس کی بے اعتدالیوں نے بدن کے جمالیات کی نئی نئی تشریح کی۔ ''مقدمہ شعر و شاعری'' کے ذریعہ خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے غزلیہ شاعری کی اس بے راہ روی کی سخت خبر لی، اور ان کی آواز کی تان آخر کار کلیم الدین احمد جیسے تلخ گو ناقد کے نیم وحشی صنف سخن کے بیان پر ٹوٹی۔

ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور ہمارا سماجی نظام اسی خوب وزشت کی دھوپ چھاؤں کے سہارے چلتا ہے، مگر ''نیم وحشی'' کا دوسرا رخ رشید احمد صدیقی کے لفظوں میں ''آبروئے فن'' بھی ہے۔ اردو غزل ان دونوں حقیقتوں سے ہم آہنگ ہے۔ اس تخلیقی کشاکش کو پرویزؔ شاہدی نے اپنے ایک شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے ؎

ہے شاعری شگفتہ جبینوں کی سجدہ گاہ
اس کو فسردہ مغز سروں سے بچایئے

غزل کی اس تمہیدی گفتگو کا مقصد پرویزؔ شاہدی کی غزلیہ شاعری کا جائزہ ہے۔ پرویزؔ شاہدی کا شمار ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے شعری سرمائے میں دو کتابیں ملتی ہیں۔ ''رقص حیات'' اور ''تثلیث حیات'' ان میں کچھ نظموں اور غزلوں کے علاوہ رباعیات بھی شامل ہیں۔

پرویزؔ شاہدی کا پہلا شعری مجموعہ ''رقص حیات'' ہے۔ یہ مکتبہ شاہراہ دہلی کے زیر اہتمام اپریل ۱۹۵۷ء میں جید برقی پریس بلی ماران دہلی سے طباعت کے مرحلے سے گزر کر منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ میں نظموں کے علاوہ کچھ غزلیں اور رباعیات کی شمولیت ہے، کل ۲۴۹ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے اندرل۔ احمد اکبرآبادی کی مقدمہ کے طور پر وہ تحریر ہے جو شاعر کا تعارف کراتی ہے۔ کچھ مارکسی نظریات کی نظمیں ہیں ان میں ''تلوار''، ''بنت ہمالہ'' قابل ذکر ہیں۔ ''گل چیں''، ''تجدید سفر''، ''انتظار''، ''آخری ملاقات'' وغیرہ میں رومانی احساسات و جذبات برتے گئے ہیں۔ رباعیات اپنا کشش آپ رکھتی ہیں۔

دوسرا شعری مجموعہ ''تثلیث حیات'' ہے جس کی اشاعت ۱۹۶۸ء میں ہوئی۔ طباعت اسرار کریمی پریس الہ آباد کی ہے اور ناشر ''ادارہ لوح و قلم'' کلکتہ ہے۔ ''متاع فقیر'' کے عنوان سے پرویزؔ شاہدی نے اپنی زندگی اور شاعری کے کچھ گوشوں کو روشن کیا ہے، جن سے آج پرویزؔ شناسی کے باب کھولے جاسکتے ہیں۔ انتساب کچھ یوں ہے:

''ان عوام کے نام ——
جنھیں خواص اپنی بارگاہ میں
باریاب نہیں کرتے۔''

ان الفاظ میں ان کے اشتراکی نظریے کی پیروی ہے اور ساتھ ہی ساتھ شہنشاہ غزل میر تقی میرؔ کے اس خیال کی اثر انگیزی بھی جسے ''گفتگو پر

مجھےعوام سے ہے'' کے روپ میں اردو دنیا کے اندر شہرت حاصل ہے۔
اس شعری مجموعہ میں مختلف ادوار کے تحت کلام پیش کیے گئے ہیں۔ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۸ء ترپن غزلیں، سولہ نظمیں ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء سات غزلیں پانچ نظمیں اور ۱۹۵۰ء سے پہلے کے تحت نو غزلیں و نظمیں شامل ہیں۔ پرویز شاہدی نے ''متاع فقیر'' کے عنوان سے اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

''میرا نام سید محمد اکرام حسین ہے اور تخلص پرویز شاہدی۔ میں ۱۹۱۰ء میں لودی کٹرہ پٹنہ سیٹی میں پیدا ہوا۔ میرا تعلق اس خاندان اور طبقہ سے ہے جو بیک وقت زمینداری اور درویشی کے راستے پر چلتا رہنا چاہتا تھا۔ میں اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑا ہوں۔'' (تثلیت حیات، ص۱۱)

اور انہوں نے اپنی شاعری و زندگی کے متعلق مزید یہ بھی تحریر کیا ہے:

''میری زندگی ہو یا میری شاعری میں نے دونوں ہی کے سہارے اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کی ہے اور احساس ناکامی کے باوجود اعتراف شکست کے لیے تیار نہیں۔ میں زندگی کے صرف نامانوس اور اجنبی گوشوں ہی سے متعارف ہونے کا متمنی نہیں بلکہ بار بار دیکھی بھالی دنیا سے بھی تجدید تعارف کرتے رہنے کا آرزومند ہوں۔ کاش صرف اپنے آئینہ دل ہی میں نہیں دوسروں کی آنکھوں میں جھانک کر اپنا چہرہ تلاش کر سکوں۔ میں نے اپنی شاعری کے آئینہ میں بھی اپنا چہرہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے کبھی کبھی ایک ہلکی سی جھلک نظر آئی اور پھر جیسے خلا میں کھو گئی۔'' (تثلیت حیات، ص۱۴)

پرویز شاہدی کی زندگی کے مطالعے سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ انہیں ۱۹۳۵ء میں ایک جذباتی صدمہ کے زیر اثر پٹنہ کو خیرباد کہنا پڑا اور کلکتہ میں زندگی کی جدوجہد شروع کی جہاں تعلیم اور اس کے بعد درس و تدریس کو روزی کا وسیلہ بنایا۔ ساتھ ہی ساتھ کمیونسٹ تحریک سے وابستگی کے تحت گرفتار ہوئے اور ڈیڑھ سال تک نظر بند رہے جس کے سبب کالج کی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ وہ بڑا صبر آزما دوران کے لیے رہا، مگر ہمت نہیں ہاری اور ایک دم توڑتے ہوئے اسکول کی ہیڈ ماسٹری سے پھر درس تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور اسے کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی صدارت تک پہنچایا۔ زندگی کی اس کشاکش کے منظرنامے ان کے اشعار لیے ہوئے ہیں، چند شعر آپ سب کی نذر ہیں ؎

کوئے ستم سے گزریں تو شوریدگانِ عشق
ہنسنے لگیں گے زخم جگر زخم سر کے بعد

بے خواب کر رہے ہیں شب غم کے مرحلے
آنکھیں جھپک نہ جائیں طلوعِ سحر کے بعد

ماہ و خور اُگانے ہیں ، کہکشاں بنانا ہے
اے زمیں تجھی کو اب آسماں بنانا ہے

پہاڑوں کی بلندی ہنس رہی ہے اس کی جرأت پر
چلی ہے نخوت لعل و گہر پتھر سے ٹکرانے

آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ پرویز شاہدی نے زندگی کا سامنا کس حوصلے اور جرأت کے ساتھ کیا ہے اور ان کی فکر میں ایک مثبت سوچ ملتی ہے، جہاں محبت بڑی معصومیت کے ساتھ ایک فطری زندگی جیتی ہے، جس کا اظہار ان کی شریک حیات فضیلت النساء صاحبہ نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد ماہنامہ ''سہیل'' کے ''پرویز شاہدی نمبر''، مطبوعہ اپریل ۲۰۱۲ء کے شمارے میں یوں کیا ہے:

''میں ساڑھے بارہ سال کے عرصہ تک اپنے شوہر کی محبوبہ بنی رہی، بیوی نہیں۔ انہوں نے مجھ سے کبھی کوئی خدمت نہیں لی۔ کبھی مجھے کوئی کام نہیں دیا، کسی کام سے نہیں روکا، میری ہنسی پر ہنس پڑے اور میرے ملال پر ملول ہو گئے۔'' (ماہنامہ سہیل پرویز شاہدی نمبر، ص۶)

اس اظہار یہ کیفیت کو خالص غزل کے مضامین میں پرویزؔ شاہدی کے یہاں ہم یوں محسوس کر سکتے ہیں جہاں دل کی دھڑکنیں اور سانسوں کی آوازیں کچھ اور کہتی ہیں ؎

یہ سنبل ونسریں میرے ہیں ، یہ صحن گلستاں میرا ہے
میں عزم نموئے گلشن ہوں ، انعامِ بہاراں میرا ہے
میں فرق بتاؤں کس کس کو احساس کی جب توفیق نہیں
کیف غم دوراں میرا ہے ، لطف غم جاناں میرا ہے

غزل کی یہ شعریت زندگی کے جمال سے پیدا ہوتی ہے۔شاید اسے ہی ہم ادبی اصطلاح میں رنگ تغزل کا نام دیتے ہیں۔ پیامی شاعر اقبالؔ نے اپنی نظموں میں اس رنگِ تغزل سے اچھا خاصا کام لیا ہے۔اقبالؔ شاعر کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مفکر بھی تھے، فلسفہ کو شعر میں ڈھالنا انہیں کا حصہ تھا۔اقبالؔ کے اسلوب اور فکر کا اثر اردو شاعری پہ بہت گہرا ہوا۔ان کے بعد بیشتر شعرا اس سے متاثر ہوئے۔ پرویزؔ شاہدی کے یہاں بھی اس ''رنگ تغزل'' کے نمونے واضح طور پر ملتے ہیں۔غزل کے فارم میں ''ساز مستقبل'' کے نام سے ایک نظم کچھ ایسا ہی وجود رکھتی ہے۔مختصر ترین سی یہ نظم چھ اشعار پر مشتمل ہے، ملاحظہ فرمائیں ؎

کتنے اصنام ناتراشیدہ
پتھروں ہی میں کسماتے ہیں
کتنے ہی نا شگفتہ لالہ و گل
ذہن بلبل کو گدگداتے ہیں
کتنے ہی جلوہ ہائے نادیدہ
ابھی پردے میں مسکراتے ہیں
ناسرائیدہ کتنے ہی نغمے
دل کے تاروں سے لپٹے جاتے ہیں
بے جلائے ہوئے دیے کتنے
رات ہوتے ہی جھلملاتے ہیں
کس نے چھیڑا ہے ساز مستقبل
آج لمحات گنگناتے ہیں

اس نظم کی غزلیہ فضا پہ غور کریں، ایک عجیب سی سرشاری و سرمستی کی کیفیت لئے ہوئے ہے۔لفظیات نے بھی معنوی دنیا کو آرزوؤں اور خواہشوں سے بھر دیا ہے۔زندگی کی جستجو اور کچھ کر گزرنے کی تمنا انگڑائی لے رہی ہے۔ اصنام ناتراشیدہ، کسمساتے ہوئے پتھر، ناشگفتہ لالہ وگل، ذہن بلبل کی گدگداہٹ، جلوہ ہائے نادیدہ، پردے کی مسکراہٹ، ناسرائیدہ نغمے، دل کے تاروں کی لپٹ، بے جلائے ہوئے دیئے، رات کی جھلملاہٹ، ساز مستقبل اور لمحات کا گنگنانا کیسی کیسی پیکر طرازیوں نے کیا کیا نقش ابھارے ہیں، سبحان اللہ! پرویزؔ شاہدی کے ان شعری اوصاف کی طرف دھیان دلاتے ہوئے پروفیسر علیم اللہ حالی لکھتے ہیں:

''کلکتے جانے کے بعد پرویزؔ شاہدی کا ماحول یکسر بدل گیا۔انہوں نے اشترا کی نظریات کو گلے لگایا تو ان کی شاعری کے موضوعات میں بھی تبدیلی آئی۔مطالعے کی وسعت نے رفتہ رفتہ انہیں لکھنؤ اسکول کے نمائندہ شاعر ناسخؔ کے لہجے سے دور کر دیا اور غیر محسوس طور پر ان کی شاعری کے موضوعات پر اقبالؔ اور غالبؔ کے اثرات واضح ہونے لگے۔''

پروفیسر علیم اللہ حالی نے اقبالؔ اور ان کے توسط سے غالبؔ کے رنگ جھلکنے کا ذکر پرویزؔ شاہدی کی شاعری میں کیا ہے اور نمونے کے طور پر کچھ اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ایک دو شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

عجب طرح کی دکھائی سبک روی میں نے
جنوں کے جوش میں منزل ہی چھوڑ دی میں نے

شب زنداں حد تنویر تک آ پہنچی ہے
صبح نو خانۂ زنجیر تک آ پہنچی ہے

میر اغالبؔ اور اقبالؔ کا شمار عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کے اسالیب اور فکر کی روشنی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔اردو شاعری کے دل، دماغ پر یہ لوگ چھائے ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ داغؔ اور امیرؔ کے استادانہ رنگ نے غزلیہ شاعری میں دو بڑے اسکول کی روایت قائم کی، اس لئے اردو غزل نے ہر موزوں طبیعت کے لوگوں کے دل کی دھڑکنوں کا استقبال کیا۔انہیں اپنے شوق کے لیے مصرع طرح کی زمین فراہم کی ۔ پیار کی

پہلی نظر اور پہلے قدم نے کچھ اور ہو یا نہ ہو، زبان کھولنے کا حوصلہ ضرور دیا۔ دیکھا جائے تو اقبالؔ بھی داغؔ سے اسی روایت کے زیر اثر فیض یاب ہوئے تھے، مگر مزاج کی بلندی نے کسی اور اسلوب کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ پرویزؔ شاہدی کی ابتدائی شاعری کے مطالعہ سے کچھ کچھ اسی طرح کی بات ملتی دکھائی دیتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''عین الہدیٰ صاحب ثمرؔ جانشین حضرت صفیرؔ بلگرامی سے رجوع کیا اور ان کو غزلیں دکھانے لگا۔ ان غزلوں کی حیثیت عطیہ استاد سے زیادہ نہیں تھی۔''

پرویزؔ شاہدی کو اللہ تعالیٰ نے جو دل اور دماغ دیا تھا، اس کے راستے کچھ اور تھے، اس لئے انہوں نے نہ تو ناسخؔ کے پرشکوہ رنگ کو پکڑا اور نہ شاعری کے اس چلن کو جہاں صرف عروض اور زبان کاغذی پھولوں کی طرح اپنی خوش رنگی پر نازاں ہوں۔ انہوں نے سیاسی وسماجی شعور کے ساتھ اپنے شعری ذوق کو بیدار کیا۔ ان کا مشہور زمانہ شعر ہے ؎

ان پڑھ آندھی گھس پڑتی ہے توڑ کے پھاٹک محلوں کے
''اندر آنا منع ہے'' لکھ کر لٹکانے سے حاصل کیا

آپ دیکھئے یہ شعر آج کے زمانے سے بھی کتنا Relevant ہے۔ ''ان پڑھ آندھی'' اس شعر میں کلیدی لفظ کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور متن کی معنویت کو بیرون متن (Sub-Text) میں تلاش کرنا ہوگا۔ غزل کا یہ رمزیہ بیان ہی اس کا حسن ہے۔ جب ہم اس شعر کے معنی تلاش کرنا چاہتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ''ان پڑھ آندھی'' کے اشارے میں شاعر کچھ گمبھیر سماجی حقیقتوں کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ ''اندر آنا منع ہے'' کا ٹکڑا صرف ایک آفس کی ہدایت نہیں رہ جاتا ہے۔

اس میں دراصل بے روزگاروں کی بھیڑ اور بے روزگاری کا مسئلہ نظر آتا ہے، جہاں فائلوں کے درمیان نوجوانوں کا مستقبل دبا ہوا دکھائی دیتا ہے اور بھوک کی طرح بے روزگاری بھی ایک عالمی سماجی مسئلہ ہو جاتا ہے جس کا حل ڈھونڈنا نئی دنیا کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس راہ میں کچھ مثبت اقدام بھی اٹھائے گئے ہیں، مگر بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر دنیا ابھی بہت الجھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ پرویزؔ شاہدی کی شاعری بالخصوص ان کی غزلیں اپنے عہد کی نمائندہ شاعری کا بہترین اور پراثر حصہ ہیں۔ انہوں نے بہت ہی معیاری اور پائیدار شاعری کے نمونے اپنی غزلوں کے اثاثے میں رکھ چھوڑے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں ؎

زلف کی طرح اس کو بس سنوارتے رہئے
زندگی کو فطرت نے خم بہ خم بنایا ہے

موقع یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرط جینے کی لگادی مجھے مرنے نہ دیا

اے زندگی نقاب الٹ کر جواب دے
فن ہم سے پوچھتا ہے کہ فنکار کیوں ہوئے

تھک کے جب سو گئے ہیں دیوانے
گدگدایا ہے بڑھ کے صحرا نے

وقار دید بڑھا اجتماع ہمت سے
بتوں نے کی ہے خدائی، پیمبری میں نے

ہوائے تند میں یہ ریشمی خیمے نہ ٹھہریں گے
کہاں تک آزماؤ گے وفاداری طنابوں کی

یہ اشعار زندگی کے گہرے تجربے سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان کے اندر جینے کی ایک نئی امید اور چاہت کی نئی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ آپ پیکر طرازی پہ غور کریں، زلف کی طرح سنوارنا، زندگی کو فطرت کا خم بہ خم بنانا، موقع یاس نظر کا نہ دینا، شرط جینے کا لگانا، زندگی سے نقاب الٹ کر جواب مانگنا، فن اور فنکاری پہ سوال، دیوانوں کا تھک کر سونا، صحرا کا گدگدانا، وقار دید کا بڑھنا، ہمت کا اجتماع، بتوں کی خدائی، آدمی کی پیمبری، ہوائے تند میں طنابوں کی وفاداری کو آزمانا...... گویا پرویزؔ شاہدی نے زندگی کے فلسفے کو حرکی نظام کے تحت سمجھنے کی سعی کی ہے اور جہاں بھی اس حرکت کے سکوت کا خطرہ لاحق ہوا ہے، انہوں نے سانس کے نغموں کی لے کو تیز کیا ہے۔ شدید بحرانی کیفیت لیے ہوئے ایک خوبصورت غزل بھی ان کے یہاں ملتی ہے۔ ملاحظہ کریں ؎

خاموشی بحران صدا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
سناٹا تک چیخ رہا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

ترک تعلق کرکے زباں سے دل کا جینا مشکل ہے
یہ کیسا آہنگ وفا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
دل والوں کی خاموشی ہی بار ساعت ہوتی ہے
بے آوازی کرب فضا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
بھیس بدلتی آوازیں ہی شام و سحر کہلاتی ہیں
وقت کا دم کیا ٹوٹ گیا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
سکتے تک اب آ پہنچا ہے بڑھتے بڑھتے کرب سکوت
ہونٹوں پر کیا وقت پڑا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
کیسی نرمی ، کیسی سختی لہجے کی کیا بات کریں
فکر ہی اب غم کردہ صدا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
جب تک راہ وفا تھی سیدھی روز یہاں تھا عیش سفر
شاید کوئی موڑ آیا ہے تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

پوری غزل احتجاجی لہجہ لیے ہوئے گہرے سکوت کو توڑتے ہوئے ملتی ہے۔ یہاں پر مجھے مشہور ہسپانوی شاعر پبلو نردا کی ایک نظم "Die slowly" یاد آرہی ہے جس میں زندگی کی دھمک کو بڑے خوبصورت پیرایۂ اظہار میں بیان کیا گیا ہے۔

اس انگریزی نظم میں زندگی سے وابستہ دیگر اشیا کی فراہمی پر زور دیا گیا ہے۔ زندگی جینے کے لیے جو ساز وسامان چاہئے اس کی آواز اٹھائی گئی ہے اور جو خاموش رہتے ہیں ان کا رہنا نہ رہنا بے کار ہے۔ گویا وہ مردوں جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ نظم بیرون ذات کی عکاس ہوا کرتی ہے، غزل انسان کے داخلی حصے کو متاثر کرتی ہے پرویزؔ شاہدی کی یہ غزل اندرون ذات کی آواز ہے۔ پرویزؔ شاہدی کی شاعری کے متعلق پروفیسر عبدالقوی دسنوی لکھتے ہیں:

> ’’پرویزؔ نے شاعری غزل گوئی کے ماحول میں شروع کی تھی اور اول اول غزل ہی سے رشتہ قائم کیا تھا......
> چنانچہ آج جہاں کلکتہ کا یا ترقی یافتہ شاعری کا ذکر آتا ہے پرویزؔ سرفہرست شاعروں میں نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں اپنے وقت کی آواز ہیں۔ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی

مختصر توقیت پرویزؔ

۱۹۱۰ء : ۳۰ ستمبر، ولادت بمقام لودی کٹرہ، پٹنہ سیٹی۔ اصل نام: سید اکرام حسین، تخلص پرویزؔ شاہدی، والد گرامی: سید احمد حسین ابن سید حامد حسین ابن سید شاہد حسین۔ والدہ محترمہ: سیدہ عائشہ خاتون بنت حافظ عبدالغفور، برادر: سید انعام حسین۔ واضح رہے کہ پرویزؔ شاہدی ایک متمول، ذی علم اور دیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں شعروشاعری کا ذوق اپنے اسلاف سے ملا تھا۔ انہوں نے فن شاعری میں مولانا عین الہدیٰ ثمرؔ سے مشورۂ سخن کا شرف پایا۔

۱۹۲۵ء : میٹرک، کلکتہ یونیورسٹی سے بحیثیت پرائیوٹ امیدوار

۱۹۲۷ء : انٹرمیڈیٹ، نیوکالج، پٹنہ سے

۱۹۳۰ء : بی اے، پٹنہ کالج سے، فارسی آنرس، فرسٹ کلاس فرسٹ

۱۹۳۳ء : نیازؔ فتح پوری کے جریدہ ’’نگار‘‘ کی وساطت سے اردو دنیا میں پہلے پہل روشناس ہوئے

۱۹۳۴ء : ایم۔اے اردو

۱۹۳۵ء : ایم۔اے فارسی پٹنہ یونیورسٹی سے ☆ کلکتہ کا سفر ☆ اسلامیہ ہائی اسکول کلکتہ میں بحیثیت معلم تقرری

۱۹۳۶ء : ۹/اکتوبر، اسلامیہ کالج کلکتہ کے مشاعرے میں شرکت

۱۹۳۷ء : (تق) انسپکٹر آف اسکول کی ملازمت

زندگی کا عکس ہیں، لیکن اگر کوئی انہیں نذرالاسلام، جوشؔ، مجازؔ اور فیضؔ کے دوش بدوش کھڑا کرے یا ان کا امام بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرے تو یہ پرویزؔی نہیں ہوگی پرویز شکنی ہوگی۔'' (سہیل پرویزؔ شاہدی نمبر، اپریل ۲۰۱۲، ص ۳۹)

میں اس بات سے تھوڑا سا اختلاف کرتے ہوئے پرویزؔ شاہدی کی غزلیہ شاعری کے دو نمونے فیض احمد فیضؔ اور اسرارالحق مجازؔ کے حوالے سے پیش کرنے کی جسارت کرنا چاہوں گا۔

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

(فیضؔ)

شان ہے موسم گل کی ترے دیوانے میں
پھول ہی پھول نظر آتے ہیں ویرانے میں

(پرویزؔ شاہدی)

فیضؔ کے شعر میں بے شک جو فضا ہے پر کیف بہاروں سے بھری ہوئی ہے۔ رنگ پیراہن، خوشبو، زلف، موسم گل، بام ان الفاظ کی ساری پیکر طرازیاں لطف وانبساط سے لبریز ہیں اور یہ صرف معشوق کے حسن کی جلوہ گری ہے، مگر پرویزؔ شاہدی کے شعر میں جو بہار قائم ہوئی اس کے دو کردار ہیں عاشق موسم گل کی شان لئے ہے معشوق ''پھول ہی پھول'' کا روپ دھارے ہوئے ہے، پھر ویرانے میں پھول کھلانے کی بات اور بہاروں میں گل افشانیاں دونوں کے فرق کو آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

(مجازؔ)

زلف کی طرح اس کو بس سنوارتے رہئے
زندگی کو فطرت نے خم بہ خم بنایا ہے

(پرویزؔ شاہدی)

مجازؔ کا شعر دنیا کی کج روی کی حقیقت بیان کر رہا ہے جہاں سب کچھ عمدہ ہوتے ہوئے بیان میں تھکن کا احساس ہوتا ہے اور یہ تھکن ایک لطیف سی

۱۹۳۸	:	بی ٹی کلکتہ سے ☆ ''جدید اردو'' کلکتہ کے مدیر مسئول ☆ ''پست قد'' اور ''شمع دان'' وغیرہ ڈراموں کی اشاعت
۱۹۴۰ء	:	۱۲، اکتوبر، بتیا راج چمپارن کے سالانہ مشاعرے کی صدارت
		☆ ۱۵، فروری، نظم ''انسانیت کی تشنگی'' آل انڈیا ریڈیو، کلکتہ سے نشر
۱۹۴۱ء	:	مدناپور کالج میں لکچرر
۱۹۴۴ء	:	کمیونسٹ پارٹی کی امیدواری رکنیت کا حصول
۱۹۴۶ء	:	اسلامیہ کالج کے پندرہویں سالانہ جلسہ ومشاعرہ میں شرکت
		☆ نومبر، سالنامہ ''جدید اردو'' میں نظم ''محرکات'' کی اشاعت
۱۹۴۷ء	:	سریندر ناتھ کالج میں لکچرر
۱۹۴۸ء	:	کمیونسٹ پارٹی کی مکمل رکنیت ☆ ''ضرب کلیم'' کلکتہ کے ادارہ تحریر میں شمولیت
۱۹۴۹ء	:	قید وبند، واضح رہے کہ یہ زمانہ تقریباً ڈیڑھ برسوں پر محیط رہا اور اس درمیان وہ دمدم اور بکسا جیل میں رہے
۱۹۵۰ء	:	قید وبند سے رہائی ☆ سی ایم او اسکول کلکتہ میں ہیڈ ماسٹر
۱۹۵۱ء	:	ریاستی انجمن ترقی اردو کی صوبائی کانفرنس منعقدہ پٹنہ کے مشاعرے میں شرکت
۱۹۵۵ء	:	۶ رنومبر، شادی ہمراہ بیگم فضیلت النسا بنت مجیب الرحمٰن
۱۹۵۶ء	:	۲۳، اگست، صاحبزادی سمینہ کی ولادت

منفی لکیر کھینچ دیتی ہے۔ زندگی کا یہ منفی پہلو مجاز کی حیات میں دیکھا جاسکتا ہے، اس کے برعکس پرویز شاہدی کے شعر میں اس کے ٹیڑھے پن کو سنوارنے کی بات کہی گئی ہے۔ پرویز شاہدی کی حیات کے مطالعے سے زندگی کی مثبت کوششوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان مثالوں کی روشنی میں پرویز شاہدی کی شاعری تنقیدی مطالعے کی دعوت دیتی ہے۔

میں ان مثالوں سے عبدالقوی دسنوی صاحب کی رائے کو رد نہیں کر رہا ہوں، لیکن اس رائے پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ضرور ہے۔ کیا واقعی پرویز شاہدی ناقدوں کے مقتول شاعر ہیں؟ یہ بھی سوال اٹھتا ہے۔ چند پرویز شناس دانشوروں کی رائے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ وہ پرویز شاہدی کی شاعری کے متعلق کیا کہتے ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی:

''پرویز شاہدی سرتاپا شاعر تھے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کسی فیشن کے تحت یا حصول شہرت کی خاطر نہ تھی۔'' (ماہنامہ سہیل، پرویز شاہدی نمبر، ص۱۰)

پروفیسر قمر رئیس:

''غزل ہو یا نظم پرویز شاہدی کی شاعری اور اسلوب شعری میں روایت کا احساس رچا ہوا نظر آتا ہے، لیکن تخلیقی سطح پر وہ نئے تجربے کرنے اور اظہار و ادا کے نئے مسائل آزمانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔''

(ماہنامہ سہیل، پرویز شاہدی نمبر، ص۲۵)

پروفیسر عبدالمغنی:

''پرویز کی تلخ نوائی میں ایک فرہاد کا آہنگ ہے ان کی شاعری شیشے کی گونج ہے، شیشے کی کھنک نہیں ہے۔''

(مریخ پٹنہ، پرویز شاہدی نمبر، دسمبر ۱۹۶۸ء، ص۴۵)

پروفیسر لطف الرحمٰن:

''پرویز شاہدی نئی ترقی پسندی کے پیش رو ہیں۔ نئی ترقی پسندی کا نظریہ ۱۹۷۰ء کے بعد سامنے آیا۔''

(ماہنامہ سہیل، پرویز شاہدی نمبر، ص۲۹)

پروفیسر وہاب اشرفی:

''پرویز شاہدی ان شاعروں میں ہیں، جنہوں نے ترقی پسندی اور اشتراکیت کو ایک ہی چیز سمجھا اور اس باب میں ان کے یہاں خاصی شدت ملتی ہے۔''

(ماہنامہ سہیل، پرویز شاہدی نمبر، ۲۷)

پروفیسر عبدالمنان:

''پرویز شاہدی عصر حاضر کے ان فن کاروں میں شمار کیے جاسکتے ہیں جن کے دم سے اردو شاعری میں چمک دمک

۱۹۵۷ء : اپریل، پہلے مجموعہ کلام ''رقص حیات'' کی اشاعت، زیر اہتمام مکتبہ شاہراہ، دہلی

☆ ۱۳، ستمبر "فلم ویکلی" میں ''رقص حیات'' پر تبصرہ جس میں اسے ''ایک باشعور شاعر کا خوبصورت مجموعہ'' بتایا گیا ہے

۱۹۵۸ء : کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر

۱۹۶۸ء : ۵رمئی، وفات بمقام کلکتہ، تدفین بمقام گوبرا قبرستان

☆ ''تثلیث حیات'' کی اشاعت بعد از وفات، ناشر ادارہ لوح و قلم، کلکتہ

☆ دسمبر ''مریخ'' پٹنہ کے ''پرویز شاہدی نمبر'' کی اشاعت

۱۹۷۴ء : اشاعت ''پرویز شاہدی: ایک مطالعہ'' مرتبہ شکیب ایاز، ناشر محفل ادب اورینٹل کالج، پٹنہ

۱۹۸۰ء : فروری مارچ ''زبان وادب'' کے پرویز شاہدی نمبر کی اشاعت

(ماخوذ از ماہنامہ ''زبان وادب'' پٹنہ جلد ۳۵، شمارہ ۵، ص۹ تا ص۱۱)

❁❁❁

باقی ہے۔ انہوں نے شاعری سے زندگی کی سماجی اور اجتماعی معنویت کے اظہار کا کام لیااور گردوپیش کی کامیاب عکاسی کی۔'' (پرویز شاہدی حیات وخدمات،ص ۷)

ابوذر ہاشمی:

''ترقی پسندشاعروں میں پرویزؔ شاہدی نمایاں حیثیت کے حامل رہے ہیں۔وہ اپنی زندگی میں ایک Icon بن کررہے۔'' (پرویزؔ شاہدی،مغربی بنگال اردو اکادمی،ص ۱۹)

پرویزؔ شاہدی کی شاعری کے بہت سارے دانشورمعترف ہیں۔میں نے ان میں سے چندلوگوں کی رائے بغیرکسی ترتیب کے پیش کی ہے۔وہیں بعض لوگوں کی یہ بھی شکایت رہی کہ تنقید نے پرویزؔ شاہدی کی شاعری کا اس گہرائی سے مطالعہ نہیں پیش کیا جس کے وہ مستحق تھے۔ زیادہ تر مضامین عقیدت مندی یا تاثراتی روش سے آگے کی راہ نہیں طے کرسکے ہیں۔اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ انہوں نے شاعری کبھی بھی اپنی شخصیت سازی کے لیے نہیں کی اورنہ اپنی شاعری پر شخصیت سازی کا ملمع چڑھایا۔

پروفیسرکلیم الدین احمد نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''اردو شاعری پہ ایک نظر'' حصہ اول کے پیش لفظ میں آرنلڈ کےقول کوبہترین شاعری کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ میں اسے یہاں نقل کرتا ہوں:

''بہترین شاعری ہمیں جستجو ہے تو اسی کی۔ بہترین شاعری میں ایک اعجاز ہے جس سے ہماری دنیا بنتی ہے جو ہمارا سہارا بھی ہے اور ہماری انبساط کا سبب بھی اور یہ سہارا۔ یہ انبساط اور کہیں میسر نہیں......اس لئے ضروری ہے کہ جب ہم شعر پڑھیں تو ہمیں اچھائی کا احساس ہو، جوحقیقت میں اعلیٰ اور افضل ہے اور جوزور اور مسرت کا سرچشمہ ہے۔اس کا زندہ احساس ہو اور یہ احساس ہمیشہ باقی رہے اور ہم جو کچھ بھی پڑھیں اس کی صحیح قدر و قیمت کی جانچ پرکھ اس زندہ احساس کی کسوٹی پر کریں۔''

پرویزؔ شاہدی کی شاعری میں یہ زندہ احساس جگہ جگہ پر ملتا ہے خاص کر ان کی غزلیں زندگی کے ہر کٹھن موڑ پر جینے کا پیغام دیتی ہوئی ملتی ہیں، ذہن ودل کے دروازے کھولتی ہوئی ملتی ہیں ؎

آیا ہے چمن میں موسم گل، آئی ہیں ہوائیں زنداں تک
دیوار کی باتیں ہولیں گی اس وقت تو در کی بات کرو

زندگی کا یہ مثبت پیغام ان کی شاعری کا حصہ ہے۔اسے انھوں نے اپنی غزلوں اورنظموں میں نہایت کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ زندگی کے اتنے روشن پہلو دیگر ترقی پسند شاعروں کے یہاں کم ملتے ہیں۔ پرویزؔ شاہدی نے زندگی کو بہت ہی مثبت انداز میں دیکھنے کی سعی کی ہے ؎

ظلمت کا طلسم توڑ کر لایا ہوں
پنجہ شب کا مروڑ کر لایا ہوں
اے صبح کا نور پینے والو ، دوڑو
تاروں کا لہو نچوڑ کر لایا ہوں

بقول اقبالؔ کہ ''خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا'' پرویزؔ شاہدی کی شاعری بالخصوص غزل اسی روش پرگامزن دکھائی دیتی ہے۔ ❁❁

امتیازی عظمت کے استحقاق کی شرط

اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ہرقوم کےعلم وادب کواس کی خصوصیات کا آئینہ داراوراس کے جذبات کا ترجمان ہونا چاہئے،اس کی شاعری کوایسی تصویر ہونی چاہئے جس میں ملک کی اقتصادی واخلاقی حالتوں کا رنگ کافی نمایاں ہو، یہی نہیں بلکہ اس میں وقت کے اثرات خدوخال بن کرنگاہ عوام کودعوت دید دیتے ہوئے نظر آئیں۔ یہ بھی غلط نہیں کہ ہرقوم کی شاعری اس کے اخلاق وعادات اورعقائدوروایات کی ایک مکمل تاریخ ہوتی ہے۔ ہرشاعروادیب اپنی قوم کا سیرت نگاراوراپنے ملک کا افسانہ خواں ہوتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ شاعری اورادب کووقت کی ضرورتوں کا ساتھ دینااورزمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ چلنا چاہئے،مگرکوئی صاحب دماغ اوراہل ذوق انسان یہ کہے بغیرنہیں رہ سکتا کہ جب تک کسی شاعر یا ادیب کے جذبات میں خلوص اورتخیلات میں بے ریائی نہیں،اس کوکوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے آپ کوکسی امتیازی عظمت کا مستحق سمجھے۔ (پرویزؔ شاہدی،اداریہ ''جدیداردو'' کلکتہ،جولائی ۱۹۳۸ء)

ساحرداؤدنگری
6/275, Lalita Park, Laxmi Nagar, Delhi - 110092 (Mob. 8800489404)

حامدالانصاری انجم: شخصیت اور شاعری

اپنے وقت کے مشہور عالم دین، خطیب، شاعر، صحافی اور صاحب طرز نثر نگار ڈاکٹر مولانا حامدالانصاری انجم کی شخصیت کے متعدد پہلو ہیں اور ہر پہلو اپنے آپ میں مکمل اور بھر پور ہے۔ آپ کا پیدائشی نام عبدالحمید تھا۔ بعد میں آپ حامدالانصاری انجم اور انجم جمال اثری سے معروف ہوئے۔ تعلیمی اسناد کے مطابق آپ کی تاریخ پیدائش ۱۵ مئی ۱۹۳۲ء اور جائے پیدائش موضع کرن جوت بازار ضلع بستی ہے۔ (یہ ضلع اب تین اضلاع میں تقسیم ہو کر بستی، سدھارتھ نگر اور سنت کبیر نگر میں تبدیل ہو گیا ہے۔ کرن جوت بازار اب سنت کبیر نگر میں آ گیا ہے) آپ نے ابتدائی تعلیم مقامی مدرسوں میں حاصل کی، پھر دہلی کے ''مدرسہ ریاض العلوم'' میں داخلہ لیا اور وہیں سے سند فراغت حاصل کی۔

اس ادارے نے ان کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۵۱ء میں وہاں سے فراغت کے بعد طبیہ کالج قرول باغ دہلی میں داخل ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں وہاں سے تکمیل الطب کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے طبابت کو بطور پیشہ اختیار کیا اور اسے بہت کامیابی سے عروج پر پہنچایا، لیکن اپنی خاص افتادِ طبع اور اپنے دینی مزاج کے زیر اثر جلد ہی طبابت سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور پھر انھوں نے تعلیمی اداروں کی راہ لی۔ اس شعبے میں انھوں نے منتظم اور مدرس کی حیثیت سے قابل ذکر خدمات انجام دیں اور متعدد مدارس بھی قائم کیا۔

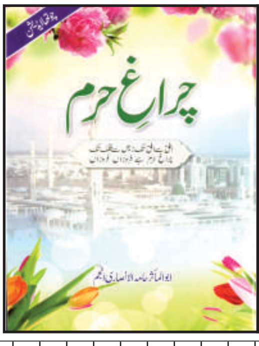

آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ نئی نسل کو عصری علوم کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے اور اسلامی شاعری، خطابت، صحافت اور وعظ و نصیحت کی مدد سے عوام الناس میں پھیلی ہوئی گمراہیوں کی تاریکی کو دور کرنے میں گزرا۔ مولانا انجم نے اپنا میدان عمل ہندو نیپال کی سرحد پر ترائی کے علاقے کو بنایا۔

آپ ایک جگہ تعلیمی ادارہ قائم کرتے، عوام میں تعلیمی بیداری پیدا کرتے، لوگوں میں بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے تعلیمی اداروں میں بھیجنے کا ذوق وشوق پروان چڑھاتے اور پھر آگے بڑھ جاتے۔ آگے بڑھنے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ انہوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ البتہ انہوں نے کہیں زیادہ عرصہ گزارا اور کہیں کم۔ اس درمیان ان کے اندر خطابت کا ذوق پیدا ہوا۔ شاعرانہ مزاج نے اس ذوق کو مہمیز لگائی اور پھر تو تین چار گھنٹے تک بیک نشست تقریر کرنا ان کے لئے عام بات تھی اور زبان میں اتنی شیرینی وحلاوت کہ مجال کیا کہ مجمع سے ایک بھی شخص اٹھ جائے۔ ان کی تقریروں میں بلند آہنگ خطابت کا بھی انداز ہوتا تھا اور ترنم آمیز وعظ ونصیحت کا بھی۔ سیکڑوں اشعار نوک زبان پر رہتے اور بوقت ضرورت ان کو استعمال بھی کرتے۔

آپ صرف خطابت ہی نہیں کرتے بلکہ حمد اور بالخصوص نعت بھی پڑھتے۔ آپ بہت خوش الحان تھے اور مترنم آواز میں نعت پڑھنے کا انداز لاثانی تھا۔ بھاری بھرکم، مگر انتہائی میٹھی آواز اور مردانہ آہنگ کے ساتھ جب نعت پڑھتے تو پورا مجمع جھوم اٹھتا۔ حب رسولؐ میں ڈوبی ہوئی ان کی نعتیں سامعین پر ایک عجیب وغریب کیفیت طاری کر دیتیں اور لوگ ان کی آواز و انداز کے سحر میں ڈوب جاتے۔ آپ کی نعتیں ایسے اشعار سے پوری طرح پاک ہیں جن میں غلو کر کے اللہ کے رسول کا درجہ بڑھا دیا جاتا ہے اور اشعار سے شرک کی بو آنے لگتی ہے۔

نعت پڑھنے کا آپ کا انداز اتنا مقبول ہوا کہ بہت سے انجم ثانی پیدا ہوگئے جوصرف انہی کی نعت، خالص انہی کے انداز میں پڑھتے اور اپنے نام کے ساتھ انجمی کی نسبت لگاتے۔ آپ کی شاعری خالص اسلامی شاعری ہے۔ سیکڑوں کی تعداد میں آپ نے نعتیں کہی ہیں اور آپ کے تقریباً ایک درجن نعتیہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے اسلامی نظمیں بھی بڑی تعداد میں کہی ہیں اور بچوں کی نظموں کی تعداد بھی سیکڑوں میں ہے، جوصرف اورصرف اسلامی رنگ وآہنگ میں ہیں۔ ان کے چھوٹے فرزند ڈاکٹر شمس کمال انجم نے سات سوصفحات پر مشتمل ان کی کلیات ''کلیاتِ انجم'' کے نام سے شائع کی ہے، جو ان کے انتقال (۱۷فروری۲۰۱۳ء) کے بعد منظرعام پر آئی۔

۱۹۶۹ء میں آپ کا پہلا نعتیہ مجموعہ ''چراغِ حرم'' جب منظر عام پر آیا تو اس نے وہ دھوم مچائی کہ بہت جلد پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور چونکہ انتہائی آسان زبان میں وارداتِ قلبی کا اظہار ان نعتوں میں تھا، اس لیے اس کی بیشتر نظمیں اور نعتیں خاص طور پر مدارسِ اسلامیہ کے طلبہ واساتذہ کو زبان زد ہوگئیں۔ رفتہ رفتہ آپ مذہبی حلقوں میں نعت خواں کی حیثیت سے بلائے جانے لگے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوش گلو بھی بنایا تھا، لہٰذا مدارس اسلامیہ کے جلسوں خصوصاً اترپردیش اور مہاراشٹرا کے جلسوں میں آپ کو بڑے اشتیاق سے مدعو کیا جانے لگا۔ ''چراغ حرم'' کے بعد آپ کے کم وبیش ایک درجن نعتیہ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور ان کی کئی نثری اور منظوم تصنیفات زیرطبع اور زیرترتیب ہیں۔ آپ جہاں نعت گو کی حیثیت سے مشہور ومعروف رہے، وہیں دنیائے ادب میں بچوں کے اسلامی شاعر کی حیثیت سے بھی آپ ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ بچوں کے ذہن ومزاج کو سامنے رکھ کر آپ نے کئی مجموعے شائع کیے ہیں۔

آیئے سب سے پہلے حضرت انجمؔ کی حمدیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہیں۔ حضرت انجمؔ کے زیرتربیت ان کے بڑے صاحب زادے جناب حماد انجم ایڈووکیٹ نے ۱۹۸۱ میں ''بہارحمد'' کے نام سے حمدیہ مجموعہ شائع کیا تھا۔ ''چراغ حرم'' میں ایک حمد شامل ہے جس میں دعائیہ اشعار بھی ہیں۔ اس حمد میں توحید پر خاصا زور دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ صرف اللہ کی ہی ذات ہے جو دنیا کی خالق ہے اور وہ یکتا اور انوکھی ہے ؎

خدائے دو عالم شہنشاہ عالی
تری ذات یکتا ، انوکھی ، نرالی
ہیں ارض و سما تیری رحمت سے قائم
تو ہے گلستان دوعالم کا مالی

آپ کی حمدوں میں دعائیہ اشعار کثرت سے ملتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے دل کی گہرائیوں میں خشیتِ الٰہی موجزن ہے۔ ان دعائیہ اشعار میں جہاں نظام جہاں کی خرابیوں کو دور کرنے کی شدید خواہش ہے، وہیں اپنے لئے بھی اللہ کی رضا حاصل ہونے کی تمنا ہے ؎

بخش دے بخش دے میرے جرم و خطا
گو نہیں میرے عصیاں کی کچھ انتہا
کاش حاصل ہو انجمؔ کو تیری رضا
ہے تمنا یہی اور یہی ہے دعا
اے خدا اے خدا اے خدا اے خدا

اللہ ربّ العزت کی کرم فرمائیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا دریائے رحمت بے کراں ہے اور جب اس میں جوش پیدا ہوتا ہے تو معمولی سی بات بھی بخشش کا بہانہ بن جاتی ہے۔ جنت اور جہنم اس کے عفو ودرگزر اور غیظ وغضب کی نشانیاں ہیں۔ اس بات کو دیکھئے کہ یہاں کس خوبصورت انداز میں اشعار کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے ؎

ترے کرم کی کوئی حد ہے اور نہ کوئی حساب
تجھی کو لوگ غفور الرحیم کہتے ہیں
ترے ہی غیظ وغضب کا وہ ایک شعلہ ہے
قسم ہے ہم جسے نار جحیم کہتے ہیں
تری خوشی کے مظاہر ہیں اے خدائے قدیر
جسے بہشت و دارالنعیم کہتے ہیں

اس طرح ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کے یہاں بہت توانا حمدیہ شاعری موجود ہے۔ یہاں چند حمدوں کی روشنی میں اظہار خیال کیا گیا ہے ورنہ آپ کی حمدوں کی یقیناً ایک بڑی تعداد ہے۔

آپ نے اپنے حمدیہ اشعار میں عالمانہ رنگ اختیار نہیں کیا ہے بلکہ سیدھے سادے انداز میں حمدیہ اشعار کہے گئے ہیں۔ان اشعار میں آورد کا دور دور پتا نہیں ہے، بس آمد ہی آمد ہے۔ نہ تو ان میں مصنوعی تجربات ہیں اور نہ ہی فنکارانہ موشگافیاں ہیں۔ ہاں دلی کیفیات و جذبات کا برملا اظہار ہے اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کی شدید خواہش، اپنے گناہوں پر ندامت وشرمندگی ہے اور اللہ سے معافی کی طلبگاری۔ اس کی رحمتوں کا بیان ہے اور انسانی لغزشوں پر اشک آوری ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنی کم مائیگی کا احساس بھی ہے۔

مولانا حامد الانصاری انجم کی شاعری پر نظر ڈالیں تو اس میں نعتوں کا بڑا ذخیرہ بھی موجود ہے۔ان کی شاعری حب رسول کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ ان میں شاعرانہ خوبیاں اور ادب کی جھلکیاں حسن کارانہ انداز میں موجود ہیں۔ وہ وارداتِ قلبی کا اتنے مؤثر اور پر کیف انداز میں اظہار کرتے ہیں کہ طبیعت عش عش کرنے لگتی ہے۔ سلاست وروانی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ نغمگی بھی ان کی نعتوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ آپ کے اکثر نعتیہ مجموعوں میں حرم اور دیارِ حرم کی تکرار ملتی ہے۔ آپ کی نعتوں کو پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم خود شہر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی گلیوں میں پہنچ گئے ہیں اور ان کی رنگینیوں اور تابنا کیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہے ہیں۔ انتہائی سیدھے سادے اور مؤثر انداز میں کہے گئے آپ کے نعتیہ اشعار سیدھے سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ سادگی و پرکاری کا ایسا شاندار امتزاج دوسرے شاعروں کے یہاں بہت کم نظر آتا ہے۔

آپ کی نعتیہ شاعری میں دو صفات بہت کثرت سے ملتی ہیں۔ ایک رسول مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وبارک وسلم سے عقیدت و محبت اور دوسرے دیارِ حرم سے وابستگی اور لگاؤ۔ یہ دونوں اوصاف آپ کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں، لیکن مجال کیا کہ کہیں تکرار ہو یا الفاظ کا کثرت استعمال ذہن ودماغ پر گراں گزر جائے۔ اگر کہیں تکرار بھی ہے تو وہ اتنے خوبصورت اور دلفریب انداز میں ہے کہ وہ شاعرانہ خوبی بن گئی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف کے ساتھ ساتھ کفر اور باطل کے درمیان تصادم بھی نظر آتا ہے اور ظاہر ہے ان پر حب رسول اللہ غالب آجاتی ہے۔ خیر البشر، خیر الوریٰ، شفیع الامم، ساقیٔ کوثر، مدینے کی گلیاں اور بہارِ مدینہ جیسے الفاظ جگہ جگہ اپنی جلوہ سامانیاں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔

جب آپ حب رسول میں ڈوب کر نعتیہ اشعار کہتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ربِ کائنات نے آپ کے قلم کو نعت گوئی کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

آستانِ حبیب خدا مل گیا
مل گیا خلد کا راستہ مل گیا
احمد مصطفیٰ کیا ملے ہم نشیں
خالق دو جہاں کا پتہ مل گیا

خلوص و محبت کی ہر بات ہوگی
جب اہلِ حرم سے ملاقات ہوگی
حرم میں کبھی دن ، کبھی رات ہوگی
ہمہ وقت ''ان'' سے ملاقات ہوگی

تمنا ہے کہ چھیڑیں آج پھر سرکار کی باتیں
رسولِ ہر دو عالم احمد مختار کی باتیں

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم ایک محبّ عاشق رسول ہیں۔ آپ کی زندگی اور آپ کی شاعری دونوں اس کے گواہ ہیں۔ آپ نے اپنے شب و روز کے معمولات میں ان سرگرمیوں کو داخل نہیں ہونے دیا جو عقیدت

رسول کے تقاضوں کے منافی ہوں اور ان سے الگ راستہ اختیار کریں۔

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم چونکہ ایک نعت گو شاعر ہیں اور اللہ کے رسول سے عقیدت رکھتے ہیں اسی لیے وہ مداح صحابہ بھی ہیں اور جہاں وہ پیغمبر اسلام کی شان میں نعت لکھتے ہیں وہیں انھوں نے اصحابِ پیمبر کی شان میں بھی نظمیں کہی ہیں۔ انھوں نے چند نظمیں ہی نہیں لکھی ہیں بلکہ ''مدح صحابہ'' کے نام سے ایک منظوم مجموعہ بھی شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ میں کل بارہ نظمیں ہیں اور متعدد قطعات ہیں۔ اس مجموعہ کا انتساب آپ نے اصحاب پیمبر ہی کے نام کیا ہے۔ ''نذرانہ عقیدت'' کے عنوان سے اس انتساب میں آپ لکھتے ہیں:

''ملت اسلامیہ و امت مسلمہ یعنی 'خیر امت' کا وہ مقدس ترین حلقہ جسے اللہ جل جلالہٗ نے اس کے حسن کردار اور پاکیزہ اشغال و اعمال سے خوش ہوکر عرش بریں سے 'رضی اللّٰہ عنھم و رضوا عنه' کے دلکش و دلربا لقب سے ملقب فرما کر اس کے مقام و مرتبہ علیا کا اعلان بالجہر فرمایا ہے اور جسے رسول رحمت، نبی مکرم، سید الاولین والآخرین، خاتم المرسلین، امام النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وفاداریوں، فداکاریوں اور جاں نثاریوں کو دیکھ کر مسرت و شادمانی کے جذبے سے سرشار ہوکر خلوص و محبت کے جھرمٹ میں فرمایا 'لا تسبوا اصحابی' یعنی اے لوگو میرے اصحاب کرام کو برا نہ کہو اور انہیں گالیاں نہ دو، جن کی حیات مستعار کا لمحہ لمحہ اسلام کے نام پر وقف ہے، جو ہر دم و ہمہ دم ہماری محفل پاک کی زینت بنے رہتے ہیں۔ میں انہی پاکیزہ اصحاب کے نام سے اس کتاب کو معنون کرتا ہوں۔ ان کے نام یہ میرے خلوص کا حسین تحفہ ہے ؎

مرے صحابہ کو گالی نہ دو خدا کے لیے
انھیں برا نہ کبھی تم کہو خدا کے لیے

''مدح صحابہ'' اصحاب کرام کی شان میں عقیدت کے سمندر میں ڈوب کر لکھی گئی نظموں کا ایک حسین اور خوبصورت گلدستہ ہے۔ اس کی نظمیں بھی انتہائی سادہ اور آسان زبان میں ہیں تاکہ ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آجائیں اور وہ اس بات کو محسوس کرلے کہ اللہ کے رسول اپنے ساتھیوں سے کتنی محبت رکھتے تھے اور وہ بھی اللہ کے رسول کے ایک ایک اشارے پر کس طرح اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ چونکہ آپ کے ساتھیوں کا لقب ''رضی اللّٰہ عنھم و رضوا عنه'' ہے اس لیے حامد الانصاری انجم نے اس مجموعہ کی پہلی نظم میں اسی کو موضوع بنایا ہے۔ پانچ بند کی یہ نظم بے حد اثر انگیز ہے اور آپؐ کے ساتھیوں کا سراپا بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتی ہے ؎

خندۂ گل ہے ان کا تبسم
نغمہ دلکش ان کا ترنم
قطرۂ شبنم ان کا تکلم
بحر ہدایت کے ہیں تلاطم
محفل ان کی محفل انجم
رضی اللہ تعالیٰ عنہم

داور محشر ان کا حامی
ان پہ فدا ہیں عالم و عامی
ان کی ہستی نامی گرامی
مدح کناں ہیں سعدیؔ و جامیؔ
ان پہ فدا ہیں ماہ و انجم
رضی اللہ تعالیٰ عنہم

ان پہ خدا کا خاص کرم ہے
سرورِ دیں کا لطف اتم ہے
زیر نگیں گلزار ارم ہے
ان پہ نازاں لوح و قلم ہے
آؤ کہیں پھر مل کر ہم تم
رضی اللہ تعالیٰ عنہم

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم کی شاعری انتہائی متنوع ہے۔ اس میں بڑی رنگارنگی ہے۔ ان کی شاعری کی کئی خوبیاں ہیں جن میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ شاعر اطفال بھی ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی اصلاحی اور

اسلامی نظموں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں اوران کونہ صرف بچوں نے بلکہ بڑوں نے بھی پسند کیا ہے۔

بچوں کے لیے وہی شاعری اچھی شاعری مانی جاتی ہے جس میں اخلاقی پہلو کونمایاں کیا گیا ہو، جس میں کردار سازی کا جوہر موجود ہو، جوانسانیت کا درس دیتی ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ وہ انتہائی آسان زبان میں ہو، جس کو پڑھنے میں بچوں کو کوئی دشواری محسوس نہ ہو۔ وہ آسانی سے انہیں ازبر ہو جائے اور اسے بڑوں کے سامنے پڑھنے میں انہیں کوئی مشکل درپیش نہ ہو۔ اگر ہم ان خصوصیات کی روشنی میں ڈاکٹر انجم انصاری کی بچوں کے لیے کی گئی شاعری پر تنقیدی نگاہ ڈالیں تو پائیں گے کہ ان میں مذکورہ خصوصیات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ وہ سادہ اور عام فہم زبان میں ہیں۔ ان کو یاد کرنا آسان اور بڑوں کے سامنے سنانا اور بھی آسان ہے۔ ان میں اخلاقی درس نمایاں ہے۔

بچوں کے لیے ان کے جو شعری مجموعے بہت مقبول ہوئے ان میں ''بچوں کے نغمے''، ''نغمہ زار انجم''، ''اسلامی ترانے''، ''نعت کے پھول'' اور ''لاہوتی نغمے'' قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مجموعوں کی نظموں کی خوبی یہ ہے کہ وہ سادہ اور عام فہم زبان میں تو ہیں ہی، چھوٹی چھوٹی بحور میں بھی ہیں اور بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ کہیں بھی ایسا نہیں لگتا کہ یہ نظمیں بچوں پر تھوپی گئی ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مذکورہ تمام مجموعے دو دو اور تین تین بار شائع ہوئے ہیں اور نہ صرف بچوں سے بلکہ بڑوں سے بھی داد وتحسین کے پھول وصول کر چکے ہیں۔ حامد الانصاری کا نونہالوں کے لئے لکھا گیا ''بچوں کے نغمے'' نامی مجموعہ تو اب نایاب ہو چکا ہے، البتہ یہاں اُن کی کتاب ''اسلامی ترانے'' میں شامل دعا کے چند اشعار دیکھیں ۔

یارب دین کی دولت دے
علم عطا کر ، عزت دے
دولت دے اور برکت دے
بخل سے ہم کو نفرت دے
کام آئیں ہم لوگوں کے
ہم کو جذبۂ خدمت دے
پڑھ لکھ کر ہوشیار بنیں
عقل بھی دے اور حکمت دے
باطل سے لڑ جائیں ہم
وہ قوت وہ طاقت دے
انجمؔ کو اور ہم کو بھی
دونوں جہاں میں عزت دے

حضرت انجمؔ کی شاعری میں انقلابی آہنگ بھی ہے۔ وہ خوابیدہ طبقات کو اپنی شاعری سے بیدار کرتے اور جھنجھوڑتے ہیں، انہیں ان کے فرائض یاد دلاتے ہیں اور سستی وکاہلی کو خیر باد کہہ کر میدان عمل میں نکل پڑنے کے لیے للکارتے ہیں۔ ان کے کلام کی مانند ان کی شخصیت میں بھی ہمیشہ خاص انقلابی رنگ رہا۔ وہ حق اور سچ کے مقابل کسی کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ ذاتی زندگی میں بھی ان کا یہی وطیرہ تھا اور ان کا کلام بھی یہی تاثر پیدا کرتا ہے۔

انہوں نے حمدوں اور نعتوں کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں اور دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے ان میں بھی مخرب اخلاق اشعار نہیں ملیں گے۔ غزلوں میں بھی ایک شائستگی ہے، ایک وقار ہے، ایک تمکنت ہے۔ وہ فن شاعری کو اصلاح معاشرہ کے طور پر بھی اختیار کرتے ہیں اور اپنے کلام سے سماجی برائیوں کو ختم کرنے پر زور دیتے ہیں ۔

پھر امن واماں کا لے کے علم خورشید نکلنے والا ہے
پھر لطف وکرم کا چشمہ نو ، عالم میں ابلنے والا ہے
پھر ذوق عمل سے بیگانہ انسان سنبھلنے والا ہے
امید کا اک اک غنچہ وگل ،گلزار میں کھلنے والا ہے
مایوس نہ ہونا اے ہمدم یہ دور بدلنے والا ہے

آپ کے پچاس سال سے بھی زائد عرصے پر محیط شعری سفر کا جائزہ لیا جائے تو بے شمار غزلوں اور نظموں پر نظر پڑتی ہے۔ انہوں نے اگرچہ قصد کر کے غزلیں اور نظمیں نہیں کہی ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کی تعداد کم نہیں ہے اور انہیں غیر معیاری بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے انتخاب پر مشتمل ایک مجموعہ ''بربط انجمؔ'' کے نام سے ۲۰۰۵ء میں دہلی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں ''اوراق پریشاں'' کے

عنوان سے نظمیں شامل کی گئی ہیں جن کی تعداد بیس ہے اس کے بعد ''رقص شرر'' کے عنوان سے غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں۔

حضرت انجم انصاری کو اردو زبان سے بہت پیار تھا اور ہندوستان سے بھی، ظاہر ہے کہ اردو سے محبت ہندوستان سے محبت کا ایک حصہ ہے اور یقیناً یہ حضرت انجم کو بخوبی ملا تھا۔ یہ ہم نہیں کہہ رہے بلکہ ان کا کلام بول رہا ہے۔ ''میرا وطن'' اور ''اردو زبان'' دو طویل نظمیں شامل مجموعہ ہیں۔ یہ دونوں نظمیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہیں نہ تو اردو زبان کے ساتھ ہو رہی زیادتی قبول ہے اور نہ ہی اپنے وطن میں اپنی بے توقیری برداشت ہے۔

مولانا حامد الانصاری انجم نے اردو زبان پر جو نظم لکھی ہے وہ بھی کسی لحاظ سے کم اثر انگیز نہیں، اس میں بھی الفاظ کا زیر و بم بھی ہے اور جذبات کی شاندار عکاسی بھی ہے۔ یہ اس زبان سے محبت کا ثبوت ہے اور اس کے عشق میں دیوانگی کی حد تک گزر جانے کی کیفیات ہیں۔ چند ابتدائی بند ملاحظہ ہوں ۔

چاند تاروں کی اس میں لطافت بھی ہے
لالہ و گل کی خوشبو ہے رنگت بھی ہے
حسن والوں کی اس میں نزاکت بھی ہے
ہر ادا اس کی ہے گل فشاں گل فشاں
یہ ہے اردو زباں، یہ ہے اردو زباں
نغمۂ زیر و بم اس کی آواز ہے
سوزِ دل کا امیں اس کا ہر ساز ہے
حسن و عشق و محبت کا اک راز ہے
زندگی اس کی ہے داستاں داستاں
یہ ہے اردو زباں، یہ ہے اردو زباں

اسی طرح حضرت انجم کی ایک دوسری نظم ''میرا وطن'' جو پندرہ بندوں پر مشتمل ہے اس میں بھی وہی خوبیاں ہیں جو اردو سے متعلق نظم میں ہیں۔ یہاں ہندوستان کی قدروں کا بھی ذکر ہے اور اس کی تاریخ بھی موجود ہے۔

ہمالہ ہے اور رود گنگ و جمن ہے
اجنتا ایلورا ہے اور ان کا فن ہے
گلستاں ہے صحرا ہے دشت و دمن ہے
گل و لالہ ہے نرگس و نسترن ہے
یہاں جو بھی جنگل ہے مثل چمن ہے
یہ میرا وطن ہے یہ میرا وطن ہے
یہاں پر ہے ناقوس، بانگ اذاں ہے
یہاں پر اشوکا ہے، شاہ جہاں ہے
یہاں رام و راون کی اک داستاں ہے
زمانے میں مشہور ہندوستاں ہے
دُر بے بہا ہے یہ رشک چمن ہے
یہ میرا وطن ہے یہ میرا وطن ہے

مولانا حامد الانصاری انجم تبلیغ و خطابت اور تعلیم و تدریس نیز شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ صحافت کا بھی ذوق و ملکہ رکھتے تھے۔ آپ نے متعدد رسالے جاری کئے جن میں ''الہلال''، ''خبر نامہ'' اور ''المؤتمر'' قابل ذکر ہیں۔ آپ کی تحریروں میں انشا پردازی کا رنگ ہوتا اور مترادفات کا استعمال کر کے اپنی تحریر کو انتہائی دلکش و دلنشین بنا دیتے اور ادبی چاشنی پیدا کر دیتے تھے۔ مترادفات کا استعمال آپ تقریروں میں بھی کرتے اور ایسا لگتا کہ جیسے تقریر اور تحریر دونوں مواقع پر الفاظ ہاتھ باندھے آپ کے سامنے کھڑے ہوں اور شاعری میں مہارت کا یہ عالم کہ غالب کی زبان میں اگر یہ کہیں تو مبالغہ نہ ہو کہ ع

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

ڈاکٹر مولانا حامد الانصاری انجم ایک بے باک، بے خوف، بے لاگ اور خوددار صحافی کی حیثیت سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اس کے گواہ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے رسائل و جرائد ہیں۔ دوران طالب علمی سے ہی ان کے اندر صحافت کا جذبہ موجزن تھا۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ معاشرے میں پنپنے والی برائیوں اور سماجی خرابیوں کو جہاں دوسرے بہت سے طریقوں سے دور کیا جا سکتا ہے، وہیں صحافت کے ذریعے بھی ان برائیوں کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس راز سے آگاہ تھے کہ ایک صحافی معاشرے کے جسم پر موجود زخموں پر نشتر زنی بہتر انداز میں کر سکتا ہے۔ جس طرح کپڑے پر آئی شکن کو گرم پریس سے دور کیا جاتا

ہےاسی طرح روح کی شکنوں کواخبارات ورسائل کے صفحات پرحدت اور شدت سے بھرپورتحریروں سے بھی دور کیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ قلم ایک ایسی طاقت ہے جوکسی کے آگے نہیں جھکتی اورقلم سے بڑے بڑے معرکےسرکیے جاسکتے ہیں۔قدرت نے ان کو جہاں شاعرانہ مزاج دیا، وہیں انہیں اثرانگیزتحریریں لکھنے کا بھی ملکہ نصیب ہوا،ان کی تحریریں گواہ ہیں کہ ان کا قلم جب کسی موضوع پراٹھتا ہےتو اس کے تمام تر پہلوؤں کا اس انداز میں جائزہ لیتا ہے کہ اس کا قاری پرایک اچھااثر پڑتا ہے۔

آپ صحافت میں مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم اور فکر کے شیدائی ہیں، اسی لیے جب اپنا پہلا جریدہ شروع کیا تو اس کا نام مولانا آزاد کے پہلے اخبار''الہلال'' کے نام پر رکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔مولانا آزاد کا''الہلال'' جہاں انگریزوں کے ظلم وجبر کی وجہ سے بند ہوگیا، وہیں ڈاکٹر انجم کا''الہلال''اقتصادی مسائل اور مالی دشواریوں کو برداشت نہیں کرسکا اور بالآخراس نے بھی جلد ہی اپنی آخری سانس پوری کرلی۔اس کے بعد انھوں نے دو ماہی ''خبرنامہ'' جاری کیا۔وہ بھی چند سال نکلنے کے بعد بند ہوگیا۔ایک تیسرا رسالہ بھی جاری کیا گیا جس کا نام''المؤتمر'' تھا مگر وہ بھی اس جہان رنگ و بو میں زیادہ دنوں تک اپنی خوشبو نہیں بکھیر سکا۔

مولانا انجم انصاری نے صالح معاشرے کے قیام اور غلط رسوم ورواج کو ختم کرنے کی ایک مہم بھی چلائی تھی۔اس کے لئے آپ نے نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کی اور نوجوانوں ہی میں سے صدر، جنرل سکریٹری، سکریٹری اور ممبران کا انتخاب کرایا اور پھر اس بزم کو سماجی اصلاح کی ذمہ داری سونپ دی۔آپ کا یہ قدم اتنا کامیاب رہا کہ پورا گاؤں پاکیزہ ماحول کے سانچے میں ڈھل گیا۔اس تنظیم کی شہرت رفتہ رفتہ قرب وجوار میں بھی پھیلنے لگی اور لوگ آ آ کر فرمائش کرنے لگے کہ مولانا صاحب آپ ہمارے گاؤں میں بھی ایسی تنظیم قائم کردیجئے۔اس تنظیم کے پلیٹ فارم سے اصلاح معاشرہ کا زبردست کام لیا گیا۔

آپ صرف ایک کامیاب اسلامی مقرر ہی نہیں تھے بلکہ سیاسی تقریروں میں بھی آپ کا کوئی جواب نہیں تھا۔آپ کے سیاسی نظریات کی اساس عوامی فلاح وبہبود پرتھی اور اس میں وہ کسی مذہب یا فرقہ کی کوئی تخصیص نہیں کرتے تھے۔

بنکر تحریک بھی آپ کی زندگی کا ایک اہم موڑ رہا ہے۔ ۷۰ء کی دہائی میں اتر پردیش میں آندھی طوفان کی مانند اٹھنے والی اس تحریک کے جو چند بنیادی کردار تھے، آپ ان میں سے ایک تھے۔آپ نہ صرف اپنے زورِ خطابت سے بنکروں کے مسائل اٹھاتے اور انہیں ایوان سیاست میں پہنچاتے بلکہ اپنی نظموں سے بنکر برادری میں زبردست جوش وخروش اور حدت وحرارت بھی پیدا کردیتے تھے۔ ❁❁

تازہ نگارشات مطلوب ہیں

اکادمی مجلّہ''زبان وادب'' کے لئے قلم کار حضرات شعری ونثری صنف ادب پر اپنی غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ، تازہ ترین تخلیقات ہمیں ارسال کریں۔ آپ کی معیاری ادبی وتنقیدی اور تحقیقی وتخلیقی نگارشات کے ساتھ ساتھ آپ کی ایسی تخلیقات کا بھی ہمیں خصوصیت سے انتظار ہے جو اصناف ادب کی تاریخ، اس کے فن پر ہوں اور مقابلہ جاتی امتحانات کے طلبا وطالبات کے لئے مفید مطالعہ ہوں۔ ہمیں بچوں کے لئے بھی نثری وشعری تخلیقات خصوصاً مختصر مضامین، کہانیاں اور نظمیں مطلوب ہیں۔تخلیقات کے ساتھ اپنی تصویریں بھی ارسال کریں۔ نگارشات صفحہ کے ایک طرف املا وانشا کی غلطیوں سے پاک صاف اور خوش خط لکھی ہوئی ہوں یا صحت وصفائی کے ساتھ کمپوز شدہ ہوں۔ ساتھ ہی نام، مکمل پتہ اردو اور انگریزی میں، ڈاکخانہ کا پن کوڈ، اپنے موبائل کا نمبر بھی لکھیں اور بینک کھاتہ جس نام سے ہے وہ نام، کاؤنٹ نمبر، آئی ایف کوڈ بھی لکھیں۔تخلیقات کے ساتھ غیر مطبوعہ غیر نشر شدہ خاص برائے''زبان وادب'' لکھنا بھی نہ بھولیں۔تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں مدیر کا فیصلہ حتمی ہوگا۔تخلیق کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، زیراکس یا فوٹو اسٹیٹ کاپی نہ بھیجیں۔

[مدیر/معاون مدیر''زبان وادب''اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ۸۰۰۰۰۴]

مقالات

ڈاکٹر صابر علی سیوانی
H. No 9-4-87/C/12, 1st Floor, Behind Moghal Residency, Tolichowki
Hyderabad - 500008 (Mob.9988796088)

ناصر علی سرہندی اوران کے ممیّزاتِ سخن

اهل همت را نبـاشد تکیه بر بـازوی کس
خیمۂ افلاک بی چوب و طناب استاده است

ناصر علی سرہندی کے اس شعر میں شکست خوردہ لوگوں اور پست ہمت افراد کے لئے سامان عبرت وموعظمت پوشیدہ ہے، جولوگ دوسروں پر اعتماد کرکے تدبیر سے انحراف کرتے ہوئے تقدیر پر بھروسہ کرلیتے ہیں، وہ لوگ زندگی کو بے مقصد جینے میں گزاردیتے ہیں اور حوصلہ وہمت سے یکسر کام نہیں لے پاتے ، جوشخص اعتماد کھو دیتا ہے وہی دوسروں کے بھروسے جیتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ مجھ سے اب کچھ ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ اگر انسان ہمت کرلے تو دنیا کی کون سی شئے ہے، جواس کے دسترس سے باہر ہوسکتی ہے۔ زندگی کی کامیابی کی اولین شرط یہی ہے کہ انسان خود کو پہچانے اور اپنی ہمت سے کام لے کر ایک ایسی دنیا پیدا کرے جو اسی سے متصف ہوجائے۔ ناصر علی سرہندی کے مذکورہ بالا شعر نے مجھے ناصر پر قلم اٹھانے کی ہمت بخشی۔

ناصر علی سرہندی ہندوستان کے دور مغلیہ کے اہم فارسی شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ناصر علی سرہندی کا تخلص علی تھا۔ والد کا نام رجب علی تھا۔ ناصر علی ۱۶۳۷ء میں سرہند میں پیدا ہوئے، مگر پرورش دہلی میں ہوئی۔ یہ دور مغل حکمراں شاہ جہاں کا دور تھا۔ ناصر علی کی جس دور میں تعلیم وترتیب ہوئی، وہ دور ہندوستان میں تہذیبی اور ادبی اعتبار سے نہایت درخشاں تھا۔ اسلامی طرز عمارت سازی کے لحاظ سے اس دور کو دور مغلیہ کا تابناک دور تصور کیا جاتا ہے۔ ناصر علی شاہجہان آباد میں رشد وہدایت کی بلندیوں پر پہنچے اور وہاں کے حالات نے ان کی شخصیت اور سیرت پر بہت اچھے اثرات مرتسم کئے۔ ناصر علی سرہندی جب اپنی شعوری پختگی کو پہنچے تو اس دور کے مشہور بزرگ شیخ محمد معصوم کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور سلسلہ نقشبندیہ سے منسلک ہوگئے۔

ناصر علی سرہندی اوائل عمری سے ہی شعر وسخن میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اپنے دور کے مشہور بزرگ اور ''تذکرۂ کلمات الشعرا'' کے مؤلف محمد افضل سرخوش کے زیر صحبت رہنے لگے۔ کم عمری میں ناصر علی کی شاعری میں اتنی پختگی پیدا ہوچکی تھی کہ لوگوں کو اس بات کا یقین ہی نہیں ہوتا تھا کہ ناصر اتنی اچھی شاعری کرنے کا اہل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے افواہ اڑا دی کہ ملا ندیم کے اشعار کا مسودہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہے اور وہی اشعار وہ اپنے نام سے پڑھ دیتا ہے۔ محمد افضل سرخوش چونکہ ناصر کے ہمدرد اور خیر خواہ تھے، انہوں نے یہ بات ناصر کو بتائی۔ چنانچہ ناصر علی کو ''استادہ است ، آفتاب، استادہ است'' والی ''طرح'' دی گئی۔ ناصر نے اعتراض کرنے والوں کا اپنے اس شعر سے جواب دیا جو شعر ضرب المثل بن گیا۔

اهل همت رانبـا شد تکیه بر بـازوی کس
خیمۂ افلاک بی چوب و طناب استاده است

ناصر علی سرہندی مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ علم دوست لوگ انہیں پسند تھے۔ جس زمانے میں ناصر سرہند میں زندگی کے شب وروز گزار رہے تھے۔ اس دور میں سرہند اہل علم وفضل کا مرکز تھا، چنانچہ ناصر کے تعلقات اس دور کے بزرگ تذکرہ نویس اور ''مـرأۃ الـخـیـال'' کے مصنف شیر خاں لودھی سے استوار ہوگئے اور ایک مشہور اہل علم ودوستدار علم نواب شکراللہ خاں خاکسار سے بھی روابط پیدا ہوئے۔

ناصر علی سرہندی نے شروع میں سیف خاں بدخشی کی ملازمت اختیار کرلی۔ سیف کو جب الہ آباد کی حکومت سونپی گئی تو ناصر بھی ان کے ساتھ الہ آباد گئے اور جب تک نواب موصوف بقید حیات رہے، وہ

ان ہی کے ساتھ رہے۔ ناصر سیف خان سے کافی متاثر تھے، چنانچہ ان کے دیوان میں کئی اشعار ایسے ہیں جن میں سیف خان کی تعریف موجود ہے۔ جب سیف خان بدخشی کا انتقال ہوگیا تو ناصر سرہند چلے گئے اور کچھ دنوں تک وہاں مقیم رہنے کے بعد ۱۱۰۰ھ میں دکن کا رخ کیا، جہاں اورنگ زیب کے لشکر کے سپہ سالار نواب ذوالفقار سے تعلقات قائم ہوئے اور ان کی مدح سرائی میں ایک قصیدہ لکھا، جس کا ایک مطلع ہے ۔

ای شان حیدری زجبین تو آشکار

نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

اس قصیدے سے مربوط واقعہ کا ذکر اور نواب ذوالفقار کی بخشش واعزاز کی تفصیل آگے آئے گی۔

ناصر بزرگوں کے عقیدتمند تھے۔ وہ جہاں جہاں گئے بزرگوں کے حلقہ ارادت سے مستفید ہوتے رہے، چنانچہ جب وہ ذوالفقار خاں کے ہمراہ کرناٹک پہنچے تو وہاں کے مجذوب شاہ حمیدالدین سے انہیں عقیدت پیدا ہوگئی۔ ناصر نے اس مجذوب کا ذکر اپنی مثنوی میں نہایت تواضع وانکساری کے ساتھ کیا ہے۔ ناصر کے ایک ممدوح شاہ عادل بھی تھے جن کا ذکر انھوں نے اپنی منظومات میں کیا ہے۔ ناصر دکن کی ریاستوں سے واپس پھر شاہ جہاں آباد آگئے اور اپنی بقیہ زندگی نہایت بے نیازی اور قلندرانہ انداز میں شاہجہاں آباد میں گزار دی اور ساٹھ سال کی عمر پا کر ۱۲/اپریل ۱۶۹۷ء کو شاہ جہاں آباد میں فوت ہوئے۔ خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار کے قریب انہیں دفن کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ ناصر پہلے بہت ہی متقی اور پرہیزگار تھے، مگر بعد میں نہ جانے کیا ہوا کہ وہ شریعت کے دائرے سے دور نکل گئے۔

ناصر علی کی شہرت اُن کے زمانے میں ہی پھیل چکی تھی، محمد افضل سرخوش نے انہیں ’’آبروئے ہندوستان‘‘ تسلیم کیا ہے۔ ناصر علی کی شاعری تصوف، معرفت، اخلاق، توکل، استغنا، تواضع وانکساری پر مشتمل ہے۔ وہ خود بھی خوددار انسان تھے۔ اس خودداری میں اللہ نے انہیں استغنا کی دولت سے نوازا تھا، اس لئے اس کی شاعری میں بلند حوصلگی، انانیت خودداری جیسے مضامین کی کثرت پائی جاتی ہے۔ خان آرزو نے ’’مجمع النفائس‘‘ میں ناصر کی ایک مثنوی کو جو یوسف زلیخا کے انداز پر لکھی گئی تھی، شور انگیز کہا ہے اور افضل سرخوش نے اسے رنگین اور ’’طرز نو‘‘ کا حامل قرار دیا ہے۔ ناصر کے دیوان کے علاوہ اس کی مثنویاں بھی اس کی یادگار ہیں۔ ایک مثنوی ’’پدماوت‘‘ کے متعلق تھی۔ یہ ہندی زبان کا قصہ شمار کیا جاتا ہے جسے ناصر نے فارسی میں منتقل کیا۔

ناصر علی کے متعلق تذکرہ نگاروں کی متفقہ رائے ہے کہ وہ نہایت دلدار اور سخی انسان تھا۔ تواضع وانکساری کے ساتھ ساتھ وہ دنیا کی حرص وہوس سے بے پرواہ تھا۔ دولت وثروت کا وہ متلاشی نہیں تھا اور نہ ہی جاہ ومرتبہ کا طالب تھا۔ استغنا اس کے خمیر میں شامل تھی۔ درویشانہ زندگی گزارنا اسے پسند تھا اور درویشوں کی صحبت اسے عزیز تھی، مذکورہ اوصاف سے متصف اس نابغہ روزگار کی سخاوت اور دلداری سے متعلق مختلف واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب میں کیا ہے:

> ’’نواب ذولفقار علی خان سپہ سالار عالمگیر کی مدح میں ایک قصیدہ کہہ کر لے گیا۔ مطلع ہی پڑھا تھا کہ ذولفقار خاں نے ایک لاکھ روپیہ مع خلعت وجواہر انعام دیا اور کہا کہ دوسرا شعر نہ پڑھئے کہ میرا خزانہ ان جواہر مضامین کی قیمت کے لئے کافی نہیں اور ہاتھی پر سوار کر کے رخصت کیا۔ وہ مطلع یہ ہے ۔
>
> ای شانِ حیدری ز جبین تو آشکار
>
> نام تو در نبرد کند کارِ ذولفقار
>
> کہتے ہیں کہ ناصر علی جب وہاں سے نکلا تو اول انعام کے لئے نواب کے ملازم اور پھر راستہ میں لوگ گرد ہوگئے۔ اس نے بھی ہاتھی ہی پر سے بیٹھے بیٹھے تمام روپیہ لٹانا شروع کیا، جب مکان پر پہنچ کر اترا تو فیل بان نے کہا کہ میرا انعام بھی مرحمت ہو۔ ادھر اُدھر دیکھ کر کہا جاؤ یہی ہاتھی تمہارا انعام ہے۔‘‘ (نگارستانِ فارس ص ۱۶۰)

ناصر علی کی دلیری اور سخاوت پسندی کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے، ناصر کی زندگی ایسے مختلف واقعات سے عبارت تھی۔ اس کی زندگی میں سب سے عظیم شئے شاعری کی وہ گتھیاں تھیں جنہیں وہ شب وروز

سلجھایا کرتا تھا۔قصائد ومثنویات میں اس نے اپنی صلاحیت کا بدیع جوہر دکھایا ہے جس سے نہ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے زبان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی، بلکہ یہ نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ راہ سلوک کا متلاشی تھا۔ اسلامی تاریخ کا اسے گہرا درک حاصل تھا اور متصوفین ومقربین بارگاہ خداوندی سے اسے گہری عقیدت وانسیت تھی۔

محمد افضل سرخوش جو ایک عظیم تذکرہ نگار تھا، وہ کہتا ہے کہ ناصر کی شاعری نہایت اعلیٰ پایہ کی شاعری ہے۔وہ بے فیض دور میں پیدا ہوا۔اسے تو ملک الشعرا ہونا چاہئے تھا:

''از اهل هند سخنور بلند خیال معنی یاب، ذوالهمت و الکمال همچو او بر نخاسته . هر بتیش چون ابر وان دلبران بخوبیهای مثل وهر مصرعش چون قامت معشوقان بر عنائی ممتاز و بی بدل. اشعار بلاغت شعارش عالمگیر و فکر هائی تازه اش یکی از بی نظیر. در ایران صائبؒ است و در هند ناصر علیؒ. حسن خلق و دل گرمی و خدا شناسی و همت و سخاوت و استغنا و بی پروائی بمرتبه دارد که در هیچ مخلوق دیده نمی شود چنانکه خود فرمود ؎

از سخن مارا دماغ دیگر است
چون صدف مغز سر ما گو هر است

"بقدر استعداد خود در هندوستان دستگاهی نیافت. در زمان بی فیض واقع شد والا این چنین نازك خیال می باید که "ملك الشعرا "عصر باشد"

(کلمات الشعرا،محمد افضل سرخوش ص ۱۲۸)

دائرۂ معاف اسلامیہ میں لکھا ہے:

''محمد افضل سرخوش نے ناصر علیؒ کا دیوان مرتب کیا تھا۔اس میں کم وبیش دو ہزار اشعار ہیں۔بیس رباعیات اور چند مختصر قصائد اور قطعات وغیرہ بھی اس کے دیوان میں شامل ہیں۔ اس کا دیوان ہندوستان کے مشہور مطبع نول کشور میں تین بار چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے۔ اندرمن مراد آبادی نے 'بہار باغ' کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے جس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسیٹی لائبریری میں موجود ہے'' (اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسیٹی لاہور جلد ۲۲ ص ۵۳)

سید عبداللہ ناصر کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مضمون آفرینی ہی اس کی حقیقی خصوصیت ہے۔خیال آفرینی، نازک خیالی، معنی یابی، بلند خیال اور معانی تازہ سب اسی ایک طرز کے مختلف نام ہیں، جب ناصر علیؒ کے مضمون کو سمجھنے کے لئے دور کی منا سبتیں تلاش کرنی پڑتی ہیں تو اس کی شاعری چیستاں نظر آنے لگتی ہے۔''

(فارسی زبان وادب ص ۲۱۲)

سید عبداللہ کی رائے سے کسی حد تک اتفاق کیا جاسکتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ناصر کی شاعری فصاحت زبان، شوخی بیان اور معنی آفرینی وخیال آفرینی کی وجہ سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ناصر نے فارسی کے عظیم شعرا سے استفادہ کیا ہے۔حافظؒ، رومیؒ، نظیریؒ اور فغانیؒ کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے، لیکن معاصرین شعرا میں سے کسی کو بھی ناصر نے اپنے جیسا شاعر تسلیم نہیں کیا ہے۔خزانۂ عامرہ (آزاد بلگرامی) کے حوالے سے ''دائرہ معارف اسلامیہ'' میں نقل ہے کہ:

''اہل بغداد عربی اور فارسی دونوں زبانیں جانتے ہیں اور ذوق وسماع کی مجالس میں اکثر اس مثنوی کو پڑھتے ہیں۔ان کا خیال ہے ناصر علی اسلوب تازہ رکھتے ہیں، لیکن مثنوی میں ہی نہیں انہوں نے غزل میں بھی ید بیضا دکھایا ہے۔'' (جلد ۲۲، ص ۵۳)

دائرۂ معارف کے اسی صفحہ پر خان آرزو کے حوالے سے ناصر علیؒ سرہندی کے شعری کمالات کا ذکر اس انداز میں مرقوم ہے:

''ان کے (ناصرؒ) اشعار شوخ اور شورانگیز ہیں اور مضامین پیچیدہ اور نازک، جہاں تک ناصر علیؒ کے موضوعات کا سوال ہے وہ زیادہ تر متصوفانہ اخلاق مثلاً توکل، ترک و

استغنا، عجز وانکسار، تواضع وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنہیں عام طور پر وہ مثالیے کے ذریعے ذہن نشین کراتے ہیں جن میں کسی دعوے کی تائید میں کوئی برمحل مثال ہوتی ہے، لیکن ان کے اشعار میں حقائق عالم کے متعلق ایسے بصیرت افروز افکار نہ ہونے کے برابر ہیں جن کی بنا پر شاعر مشرق علامہ اقبال نے بیدلؔ کو ہمارا عظیم مفکر شاعر کہا تھا۔'' (دائرۂ معارف، ص۵۳)

مذکورہ ناقدین کی آرا سے کسی حد تک مولانا محمد حسین آزاد بھی اتفاق کرتے ہیں اور ناصر کے خیالات وافکار کے حدود متعین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ نازک خیالی اور معنی یابی میں بے عدیل تھا، مگر مشکل یہ ہے کہ خیال کرتے کرتے ایسا خیال میں غرق ہوا ہے کہ بعض جگہ بالکل شیخ خیالی ہوگیا ہے اور اکثر معنی کی تلاش میں ایسا ڈوبا ہے کہ بے معنی ہوگیا ہے۔''

(نگارستان فارس ص۱۵۶)

سرخوش ناصر علیؔ سرہندی کے متعلق بہت اچھی رائے رکھتا تھا۔ اس کی قدر کیا کرتا تھا اس کے فن کا معترف تھا، مگر اس کی تعریف میں اس نے کہیں کہیں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور اسے اپنے دور کا فارسی شاعری کا امام تصور کیا ہے، حالاں کہ اس کے معاصرین میں صائبؔ تبریزی بھی تھا، جس کی شاعری تمثیلات کی بہترین مثال تصور کی جاتی ہے۔ صائبؔ نے اپنی شاعری سے اپنے مخالفین کو بھی مدح سرائی پر مجبور کردیا۔ سرخوش ناصرؔ علی کی شاعری کی تعریف کرتے ہو کہتا ہے ؎

درملکِ سخن بود جهانگیر علی
در مشرب دل ولئ میر علی
با شعر علی نمیر سد شعر کسی
زانسان که خط کس بخطِ میر علی

میر علی تبریزی خط نستعلیق کا امام تصور کیا جاتا ہے۔ خط نستعلیق کی ایجاد میر علی تبریزی نے کی اور اس خط میں ایسی رعنائی اور زیبائی پیدا کی کہ آج بھی خطاطین اسی کی پیروی کرتے ہیں، سرخوش کے مطابق جس طرح میر علی تبریزی فن خطاطی میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا، اسی طرح ناصر علیؔ سرہندی کی شاعری کے کمال تک کوئی دوسرا شاعر پہنچ ہی نہیں سکتا۔ وہ یکتائے روزگار ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں ناصرؔ کی شاعری کے مختلف اور منفرد رنگ کو جس سے اس کی شاعری کی رفعت ومنزلت کا اندازہ ہوسکے گا ؎

امشب که بی تو بزم سخن نیمرنگ بود
رنگی که باز گشت بدل زخمِ سنگ بود
دردل طپش زجوشِ خیال تو ره نیا فت
آئینه شد چراغ که کاشانه تنگ بود
گو در رَهت برنگِ شفق فوجِ بسمل است
امروز بادل که خیالت بجنگ بود
تا آسمان ز دیدۂ قربا نیاں براست
باآنکه عشق را بکمان يك خد نگ بود

ندارد حسرت دل تاب حسن بے حجا بش را
که باشد صافئی آئینه شبنم آفتا بش را
نظر ها غافل و عالم پر از کیف حُسنش
بود حکم پری در شیشه ها رنگِ شرابش را
بمحشر حرف بی صو تست فریاد شهیدانش
نمیدانم که داد این سُرمه چشم نیم خوا بش را
بشوخی پای اوبو سیدن و قالب تهی کردن
کدامی بی ادب تعلیم فر ماشد رکابش را
ندانم دل شهید کیست ، لیکن این قدر دانم
که از شمشیر او رنگیست موج اضطرابش را
باین شوخی غزل گفتن علیؔ از کس نمی آید
بایران میفر ستم تاکه بنو یسد جوابش را

یہ اشعار واقعتاً ناصر کی بلند خیالی، شوخی بیان اور طرز اظہار کی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ لفظوں کے زیر وبم، استعارہ اور کنایہ سے لبریز شعری پیکر تراشی کے ذریعے ناصر نے جو حسن پیدا کیا ہے اس سے اس کی استادی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان اشعار سے ہم سرخوش کی رائے سے متفق ہونے پر مجبور ہوجاتے ہیں، مگر تعلّی کے طور پر اس کا مذکورہ آخری شعر اس کی انانیت اور خود پسندی کو ظاہر کرتا ہے جس سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال ناصر کی شاعری میں تہہ داری، فکری رفعت اور حسن شعری کا عنصر

نمایاں طور پر موجود ہے، جو اس کی شاعری کو دو آتشہ بنا دیتا ہے۔

ناصر علی کی شاعری میں ہندوستانی رنگ اور ایرانی تہذیب بیک وقت نظر آتی ہے۔ شعری حسن اور صناعت لفظی و معنوی کی بہاریں بھی بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔ زندگی کی حقیقت اور خودداری و انانیت کی خوبصورت تصویر کشی ناصر علی کی شاعری میں اہم مقام رکھتی ہے، عشق و محبت کی عمدہ پیکر تراشی اور تصوف و معرفت کی حسین عکاسی بھی اس کی شاعری کے حسن میں اضافے کا باعث بنتی ہے ۔

بمحفلی که حریفان بیاد حق مستند
نفس زدی و چو آئینه بر تو در بستند
توبه هارا نفس باز پسیں است دَروا است
بیخبر ! دیر رسیدی در منزل بستند

علیؔ از اضطرابم کام دل حاصل نمیگردد
خطا شد بارها از بیقرار یهای من تیرش

کریم را نه رسد بهرۂ زمایۂ خویش
هما چگونه نشیند بزیر سایه خودش

درواوی که تیره شبم جلوۂ نمود
نور هزار شمع زبان غزال داشت

روشنی کم میکنند در ظلمت کا شانه ام
هست خال چهرۂ زنگی چراغ خانه ام

وحشتم از دل هر ذرّه نمایان کر دند
آنقدر جمع نبودم که پریشان کر دند
جادۂ راه محبت که دم شمشیراست
نفس سوختۂ بود که پنهان کردند

يك شهر چشم خوش نگهان فرش راه اوست
آنجا که سرمه گرد کند جلوه گاه اوست

همت درویش از منعم شدن کمتر شود
از چکیدن باز ماند قطره چون گو هر شود

درویش صفت افراد کی ہمت مردانہ کی داد دیتے ہوئے ناصر کہتا ہے کہ کسی درویش کے پاس دولت آجائے تو اس کی ہمت قلندرانہ کمزور ہو جاتی ہے، اس لئے اس کی رائے ہے کہ درویش کو دولت کی حرص نہیں ہونی چاہئے۔ وہ عشق کی اہمیت کو اپنے مخصوص لب و لہجے میں اجاگر کرتا ہے۔ تخیل کی وسعت ناصر کی شاعری میں بڑی معنویت پیدا کرتی ہے، لیکن اس کا سب سے بڑا جوہر یہ ہے کہ وہ اپنی خود اعتمادی پوری شاعری میں بکھیرتا ہے اور اعتماد کی دولت حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہی دولت انسان کو عظیم تر بنا دیتی ہے۔ اس کی شاعری مقصدیت سے مملو ہے۔ کہیں کہیں ثقالت کے پہلو بھی اس کے اشعار میں دیکھے جاتے ہیں، تاہم معنوی اعتبار سے وہ اپنے دور کا بزرگ ترین شاعر ہے، ملاحظہ کیجئے یہ اشعار ۔

مقیم کوی تو سختی کشان دل تنگ اند
که ناله گر نکنند فاش آتش سنگ اند
ملائمت ز تنك ظرفی گریختن است
که شیشها چودر انداختی بهم سنگ اند
شکر لبان دل بیر حم در کمین دارند
بتانِ ما ز برون لعل و ازدرون سنگ اند
طلسم صورت ما بر بتان شکست آورد
وگر نه دیر و هرم خانه زاد يك سنگ اند
زخامئی ثمر نو نهال شکوه مکن
که پختگاں همه بهر شکست خود سنگ اند

ناصر علی سرہندی کی شاعری تمام اوصاف شعری سے آراستہ ہے۔ زور بیان، جوش تفکر اور علو تخیل سے مزین ناصر کی شاعری اپنے الگ اور منفرد لب و لہجے کی حامل ہے، جس میں زندگی کی صداقت اور بشری تقاضوں کا پاس ہے، حصول دنیا کی تگ و دو سے کنارہ کشی کی تبلیغ بھی ہے۔ ناصر علی اپنے دور میں ناقدری کا شکار رہا اور آج بھی ناصر کی شاعری اہل علم کی عدم توجہی کی شکار ہے۔ کاش ناصر کے ہمہ جہت اوصاف کا تعین کیا جاتا۔

(کلمات الشعرا، محمد افضل سرخوش، طبع لاہور ۱۹۱۲ء، مرأة الخیال ، شیر خاں لودھی، طبع منشی سلیم اللہ ۱۸۳۱ء، سرو آزاد، آزاد بلگرامی، حیدرآباد ۱۹۱۳ء، خزانۂ عامرہ، آزاد بلگرامی، کانپور ۱۸۷۱ء، مجمع النفائس ، خان آرزو، پنجاب یونیورسٹی، قلمی، تذکرہ نتائج الافکار، قدرت اللہ گوپاموی، بمبئی، شعر العجم ج ۳، ۱۹۱۰ء اور فارسی زبان وادب، سید عبداللہ، لاہور ۱۹۷۷ء سے خصوصی اخذ و استفادہ کے ساتھ) ❁❁

ڈاکٹر محمد مجاہد حسین
Asst. Prof. & Hod Urdu, Purnea College Purnia - 854301 (Mob. 9955978665)

فیض احمد فیضؔ کی مزاحمتی شاعری

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ عہد بدلتے رہتے ہیں اور ہر عہد ایک خاص فکر اور مخصوص فلسفہ اپنے ساتھ لاتا ہے اور اس کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ وہ فکر اور فلسفہ ہوتا ہے جو اس عہد کی اقدار، روایات، رسوم اور رواجوں کی بدولت معاشرے کے روح و جسم میں جاری و ساری ہوتا ہے اور اسی سوچ، فکر اور فلسفے کا اظہار اس عہد کا فنکار کرتا ہے۔ اسی بات کو یوں بھی کہا جاتا ہے کہ فن کار بہر صورت اپنے عہد کا پروردہ ہوتا ہے۔ وہ فنکار چاہے مصور ہو، چاہے سنگ تراش، چاہے موسیقار، گلوکار، اداکار ہو یا شاعر و ادیب بہر صورت وہ کسی عہد اور کسی سماج میں ہی پیدا ہوتا ہے، زندگی گزارتا ہے اور اس سے اثرات قبول کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ فنون لطیفہ کبھی بالواسطہ، کبھی براہ راست زمانے کے فکر کی پیروی کرتے ہوئے اپنا وجود ثابت کرتے ہیں۔ فنکاروں کے اس گروہ میں شاعر و ادیب کی اہمیت دوسروں سے کچھ مختلف اور زیادہ ہوتی ہے، کیوں کہ وہ جذبات کو الفاظ کی شکل دے کر، درد کو لفظی تصویر میں ڈھال کر، عشق، حسن اور خیال کو زیب و زینت دے کر زندہ جاوید کر دیتے ور ایک عالم میں پھیلا دیتے ہیں۔

ہم مصور کے فن پارے کو یا سنگ تراش کے شاہکار کو دیکھے بغیر اس کی قدر و قیمت، اس کی اہمیت، اس کی معنویت سمجھ نہیں سکتے اور نہ ہی اس کے بارے میں کوئی نتیجہ سنا سکتے ہیں، لیکن شاعر کا حسن تخیل لفظیات کا لبادہ اوڑھ کر سماعتوں تک یوں رسائی حاصل کرتا ہے جیسے ہوا کے دوش پر سوار خوشبو نگر نگر پہنچتی اور مشام جاں کو معطر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظوں کے جادوگر، ایک ادیب شاعر کی حیثیت دوسرے فنکار کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند اور بااثر مقام پر رہتی ہے، لیکن یہ طے ہے کہ معاشرے میں اپنے زمانہ اور آنے والے عہد میں وہی شاعر، وہی ادیب جگہ بناتا ہے جو فکر و سخن کے چراغ اپنی پیہم ریاضتوں کے روغن سے جلاتا ہے۔

مذکورہ تناظر میں دیکھیں تو پچھلی صدی میں اقبالؔ کے بعد فیضؔ اس دلآویز مقام پر متمکن دکھائی دیتے ہیں، جس تک پہنچنے کی ہر کوئی آس و حسرت کرتا ہے، مگر سرخرو وہی ہوتے ہیں جو عہد کے تقاضوں کو سمجھتے اور پرکھتے ہوئے، زمانے سے آشنا ہوتے ہوئے ان آوازوں کو اپنے دل و دماغ میں اتار لیتے ہیں۔ یہ مستقبل کو حال کے آئینے میں دیکھنے اور دکھانے کا وصف ہوتا ہے جو بس خال خال فنکاروں کے حصہ میں ہی آتا ہے، اسی کو ہم انفرادیت بھی کہہ سکتے ہیں اور فیضؔ نے شاعری کے آسمان پر اپنی اسی انفرادیت کے باعث وہ جگہ بنائی ہے جو بہت ہی پرنور اور بہت ہی روشن ہے۔

فیض احمد فیضؔ بیسویں صدی کے ان خوش قسمت شعرا میں سے ہیں جنہیں اپنی زندگی میں بے پناہ شہرت اور عظمت ملی۔ انہوں نے دار و رسن کا مزہ بھی چکھا اور کوچہ یار کی رنگینیوں اور دلکشیوں سے بھی لطف اندوز ہوئے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور انہیں انگریزی، عربی اور اردو ادب پر زبردست عبور حاصل تھا۔ ان کی ذہانت نے نئے راستے تراشے۔ وہ علامہ اقبالؔ کے استاد مولوی میر حسن ہی کے شاگرد تھے، لیکن وہ اقبالؔ نہ بن سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کی سوچ اور زاویۂ فکر میں تضاد تھا۔ اقبالؔ نے اسلام کو انقلابی مذہب جانا، جب کہ فیضؔ نے کمیونزم کے راستے انقلاب کا خواب دیکھا۔ دونوں کی شاعری میں یہ فرق بہت واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ اگر چہ اقبالؔ کے بعد اردو شاعری آگے نہیں بڑھی، لیکن اس میں فیضؔ نے تنوع ضرور پیدا کیا۔ فیضؔ کی شاعری فکری انقلاب کی دعوت دیتی ہے اور اس عصری رجحان کی۔ انہوں نے جس انفرادی لب و لہجہ کے ساتھ ترجمانی اور مرقع کشی کی ہے وہ انہیں اپنے ہم عصر شاعروں میں ممیّز اور منفرد بنا دیتی ہے۔ گوپی چند نارنگ کے لفظوں میں:

> ''فیضؔ کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے انقلابی آہنگ پر جمالیاتی احساس کو اور جمالیاتی احساس پر

انقلابی آہنگ کو قربان نہیں کیا بلکہ ان دونوں کی آمیزش
سے ایک نیا شعری رچاؤ پیدا کیا ہے۔ان کی شاعری
میں جو دل آویزی، دل آسائی، نرمی اور قوت شفا ہے وہ
اس عہد کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔''

فیض نے اپنی شاعری کا آغاز رومانیت سے کیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ ان کی شاعری کا یہ رومانی پہلو نہایت دلکش اور دل آویز ہے۔

فیض احمد فیض ''ترقی پسند'' شعرا کے سلسلے میں داخل وشامل تھے۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں، ترقی پسند شاعر اپنی بین الاقوامی دلچسپی کے باوجود شاعری کے بین الاقوامی معیار کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامی سیاست واقتصاد سے شاعری کی نسبت زیادہ غرض رکھتے تھے۔یہ ٹھیک ہے کہ اقبال کی طرح ان ترقی پسند شعرا کی شاعری، ان کا مقصد نہیں، ذریعہ تھا، شاعری ان کے لئے محبوب نہیں قاصد تھی۔ترقی پسند شعرا نے بھی اچھی شاعری کے نمونے پیش کئے تھے، لیکن یہ تب ہوا جب شاعری نے ان کے غیر سیاسی نظریہ پر فتح پالی تھی۔ اقبال کے شعری لہجے کی انفرادیت نے ان کے مقاصد کو شعری جامہ پہنانے میں خاصا تعاون دیا ہے۔علی سردار جعفری، احمد ندیم، مجاز اور فیض کے یہاں اکثر وبیشتر مقصدیت غالب ہو جاتی ہے۔

ہمارا موضوع بحث ''فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری'' ہے، تو ہمارے ذہنی افق پر ایک سوال اُبھرتا ہے کہ ان کی شاعری میں مزاحمت کے احساسات کیسے آئے، اس کا پس منظر کیا ہے؟ ایسے کیا واقعات و حالات رونما ہوئے جس کے باعث فیض نے اپنی شاعری میں مزاحمتی لہجہ اختیار کیا۔فیض کی شاعری میں مزاحمت کے مطالعے سے قبل ہمیں ان نظریات کا جائزہ لینا ضروری ہے جو فیض کی فکر کی بنیاد ہیں۔

فیض کی شخصیت کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سینے میں دردمندی کا جذبہ رکھتے تھے اور انسانوں پر انسانوں کے ظالمانہ اور استحصالی رویوں کو بڑے دکھ کر ساتھ محسوس کرتے تھے۔فیض معاشرے میں ایسا انقلاب برپا کرنے کے خواہش مند تھے جو موجودہ استحصالی نظام کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دے۔وہ غیر طبقاتی نظام کے قائل تھے۔ان کا خیال تھا کہ اگر انسان کے ہاتھوں انسانوں کا استحصال اور بے مقصد جنگیں ختم ہو جائیں تو انسان کے حالات بدل سکتے ہیں۔وہ معاشرے میں رسمی طریقے سے انقلاب برپا کرنے کے بجائے مادی و خارجی طور پر ایسے انقلاب کے داعی تھے جو دیرپا ہو، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اس طرح طبقاتی شعور سے لیس ہو کر جدو جہد سے گزرنا ہوگا۔ فیض نے اپنے عہد وعصر کے جبر واستحصال کی قوتوں کو پہچان کر دنیا میں جہاں کہیں خیر وامن کی آواز بلند ہوئی انہوں نے اس کا ساتھ دیا۔

فیض کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مجموعے ''نقش فریادی'' کے پہلے حصے میں فیض نے غزل کے پیرائے میں محبت اور طبقاتی جدو جہد کی سرگزشت کا امتزاج پیش کیا اور ''نقش فریادی'' کے دوسرے حصے میں رومانیت سے سماجیت کے میدان میں قدم رکھا اور پھر ان پر سیاسیات نے یوں غلبہ پایا کہ آخر آخر تک ان کے سارے کلام میں سیاسی تصورات ہی جابجا بکھرے نظر آتے ہیں ؎

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پر غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کر ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

(رقیب سے)

فیض کے بارے میں میرا خیال ہے کہ ان کی شخصیت اور شاعری اردو شعرو ادب کی دنیا میں ایک اجتہادی حیثیت رکھتی ہے۔اردو شعر وادب کی دنیا میں ایک بڑے سیاست داں، صحافی، مفکر یا ادیب ہی نہیں بلکہ وہ بیسویں صدی کے ایک بڑے اور اہم شاعر تسلیم کئے گئے ہیں۔غالب اور اقبال کے بعد فیض کو ہی یہ ملک گیر اور عالمی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ان کو بین الاقوامی لینن ایوارڈ سے نوازا گیا تو یقیناً اس کی بڑی معنویت ہے۔

فیض کی شخصیت میں زبردست شعری اور تخلیقی صلاحیت تھی، جس کے زیر اثر وہ تا عمر اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار شعری پیرائے میں کرتے رہے۔انہوں نے انسانیت کے درد کو اپنا درد سمجھا۔ان کی شاعری رومان پرستی اور حقیقت پسندی کا خوبصورت مرقع ہے۔ان ہی دو سرچشموں سے ان کے فن کی آبیاری ہوتی ہے۔اپنے ذہنی سفر کے بارے میں انہوں نے خود ہی کہا ہے ؎

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

یہ کوئے یار اور سوئے دار اصلاً دو محور ہیں جن کے گرد ان کی شاعری گردش کرتی نظر آتی ہے۔ان کے کلام میں غم جاناں اور غم دوراں کا التہاب ہے۔ سرفروشی اور رومانیت کا خوبصورت سنگم ہے،جس نے ان کی شاعری کو معنی آفرینی اور تخیل کے مختلف زاویوں سے آشنا کیا ہے۔چونکہ ان کی شخصیت کا رشتہ غم عشق اور غم حیات دونوں سے ہے اس لئے ان کی شاعری ''روداد قفس'' بھی ہے اور ''سرگزشت دل'' بھی ؎

اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مرا دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

مجموعہ کلام ''نقش فریادی'' سے ''مرے دل، مرے مسافر'' تک فیض کا مزاحمتی لہجہ عروج کے منازل کو چھوتا ہے۔یہ بات سچ ہے کہ فیض کے ابتدائی کلام میں رومانیت کو اولیت حاصل تھی اور اس وقت اشترا کی انقلابیت پس آئینہ۔بقول اختر اورینوی:

''رومان و محبت فیض کی شاعری کا وسطی دھارا ہے اور اشترا کی انقلابیت محض پس آئینہ کی حیثیت رکھتی ہے۔''

پروفیسر اختر اورینوی مزید لکھتے ہیں کہ:

''فیض اشتمالی انقلاب برپا کرنے کی کوشش میں گرفتار زنداں ہوئے ہیں،لیکن وہ اپنی شاعری کو بھونڈے پروپیگنڈے کا وسیلہ اکثر و بیشتر نہیں بناتے۔جدید' ترقی پسند' شعرا میں فیض نمایاں طور پر سلجھے ہوئے فنکار ہیں۔''

فیض کا عشق محض شاعرانہ تخیل نہیں اور نہ ہی روایتی یا رسمی عشق ہے بلکہ وہ ایک سچا انسانی جذبہ بن کر سامنے آتا ہے ؎

تری دید سے سوا ہے ترے عشق میں بہاراں
وہ زمیں جہاں گری ہے تری گیسوؤں کی شبنم

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گذار کے

لیکن پھر وہ جلد ہی رومانیت سے حقیقت کی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کے متحرک کارکن بن جاتے ہیں۔مستقبل کے خواب،تلخ حقائق،غم روزگار،نئے افق کی تلاش،مروجہ سماجی نظام سے بیزاری اور جہد مسلسل کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اپنی شناخت اس حوالے سے مستحکم کر گئے۔ مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ کیجئے ؎

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

فیض کی مزاحمتی شاعری کا ایک اور وصف ان کا اعتدال پسندانہ رویہ ہے۔انہوں نے اپنے کلام میں تلخی حیات اور تلخی حالات کا ذکر ضرور کیا ہے،لیکن کبھی بھی کڑواہٹ کو شاعری پر حاوی نہیں ہونے دیا ہے۔ان کے یہاں بیزاری یا جھلاہٹ نہیں ہے۔ان کا رویہ ہر جگہ مثبت اور رجائی ہے۔ انقلابی نعروں کو شگفتگی اور نرمی عطا کر کے ان کی پذیرائی میں جس طرح انہوں نے اضافہ کیا ہے۔وہ انہیں کا حصہ ہے''صبح آزادی''،''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے''،''اے دل بیتاب ٹھہر''،''شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں''،جیسی نظموں میں شعریت اور غنائیت کا فقدان نہیں،بلکہ ایک ایسا البیلا وفور ہے جو قاری کو آج بھی محو حیرت بنا ڈالتا ہے۔

طرز و اسلوب کے اعتبار سے فیض کی شاعری قدیم اور جدید میلانات کا خوبصورت مرقع ہے۔ان کے یہاں جہاں قدیم کلاسیکی شاعری کا فنی رچاؤ،انسان دوستی،جذباتی کسک،نغمگی اور ترنم موجود ہے،وہیں جدید میلانات و رجحانات کا عکس بھی ان کے کلام میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کی شاعری میں بعض جگہوں پر انگریزی کی رومانی شاعری کا اثر بھی نمایاں ہے ؎

گلوں میں رنگ بھرے بادنو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

ان کی شاعری میں تشبیہات کم ہیں اور اس لئے کم ہیں کہ وہ تشبیہوں کے استعمال میں کافی احتیاط برتتے ہیں۔انہوں نے نہ صرف فرسودہ تشبیہوں اور عام سطح کے استعاروں سے ہمیشہ گریز کیا ہے،بلکہ اس کے برعکس نئے سانچے اور تلازمے تلاش کر کے نہایت دلکشی اور دل فریبی کے ساتھ اپنی شاعری میں ایک اچھوتا رنگ و روغن لا دیا ہے ؎

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

فیض احمد فیضؔ محض واردات عشق کے شاعر نہیں تھے۔ حیات کی بصیرت اور سنجیدہ شعور نے ان کے فکر وفن کو بہت سے زاویوں سے متاثر کیا تھا۔ ان کی شاعری میں عرفان حیات کے ساتھ نغمگی بھی ہے اور اس لئے ان کی آواز شیریں بھی ہے اور سنجیدہ بھی۔ انہوں نے عصری حسیت اور عرفان ذات کو شعری فن کے ساتھ اس طرح محلول کر دیا ہے جو ذہن پر ایک الگ تاثر چھوڑتا ہے۔ ان کے فن نے ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو مقبولیت اور شہرت فیضؔ کو نصیب ہوئی وہ ان کے دوسرے معاصرین کو نہیں مل سکی۔ ان کی شاعری میں ایک صاحب دل کا جوش اور ولولہ ہے، جس میں پوری قوم کا دل دھڑک رہا ہے۔ ان کی شاعری وطن کی محبت بھی ہے اور قوم کے لئے تڑپ بھی۔

آیئے اب ہم فیضؔ کے اس کلام کا مطالعہ کریں جس میں وہ معاشرے کے سفاک حقائق، اقتصادی مسائل، حکومتی نظام پر طنز، سیاسی جبر کی تلخ تصویر پیش کرتے ہیں۔ وہ کبھی جیل کی سلاخوں میں نظر بند ہو کر ''آج بازار میں پابہ جولاں چلو'' کا نعرہ لگاتے ہیں اور جب کبھی انسان کو ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے پر روکا جائے تو اس پر بایں طرز اپنا احتجاج اپنی شاعری کے حوالے کر دیتے ہیں کہ ؎

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جان اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دکان میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم وزباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہو کہہ لے (نظم بول)

فیضؔ کی یہ نظم ایک زبردست رجزیہ آہنگ رکھتی ہے، یہ آہنگ پہچان کا ایک حصہ ہے اور دنیا جانتی ہے کہ اپنی شاعری میں انقلابی ومزاحمتی اظہار کے باعث ایک بار نہیں، بار بار انہیں وطن بدری کرنی پڑی۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، اقبالؔ کی منزل نظام اسلام کا قیام ہے جس میں سرمایہ ومحنت کے منصفانہ تقسیم کا بندوبست موجود ہے، جب کہ فیضؔ کی منزل غیر اسلامی نظریہ حیات سوشلزم ہے اور وہ اپنے نظریہ کی تبلیغ کے لئے اپنی شاعری میں مزاحمتی وانقلابی اظہار رومانیت کے پیرائے میں کرتے ہیں۔ ان کی شاعری خصوصاً نظموں کا آغاز رومانیت سے اور انجام انقلابیت ومزاحمت پر ہوتا ہے کیوں کہ فیضؔ محبت وانقلاب کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہمیں فیضؔ کی آواز دنیا کے ہر اُس گوشے، ہر اس نگر سے سنائی دے گی جہاں انسانوں کا انسانوں کے ہاتھوں استحصال ہو رہا ہوگا۔ عالمی پیمانے پر انسانیت کے استحصال کا وہ سلسلہ ہی ہے جس کے باعث فیضؔ کو اپنی شاعری میں مزاحمتی انداز اختیار کرنا پڑا۔ مزاحمت پسندی کے دو رُخ ہوا کرتے ہیں ایک نرم اور دوسرا گرم، فیض نرم روی سے سروکار رکھنے والے شاعر ہیں۔ وہ دبے پاؤں آنے والے انقلاب کی کامیابی پر یقین رکھتے ہیں اور دھیمے، مگر پرتہور لہجہ میں لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک غیر مرئی کیفیت کو بھی الفاظ کے ذریعہ مجسم اور مرئی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔

فیضؔ کی مزاحمتی شاعری جوشؔ کے جوشیلے لہجہ کی نہیں، بلکہ ایک ایسے سلجھے ہوئے لہجہ کی شاعری ہے جس میں مزاحمت نے انداز سے زیادہ افکار کی بدولت گرمی پایا ہے اور یہ وہ خوبی ہے جو فیضؔ کے معاصرین کی شاعری میں برائے نام ہی ملتی ہے۔ یہ خیال رکھنا کہ انتہائی غصہ میں دہن کیا، زبان بھی نہ بگڑے اور تیور اپنا مقصد بھی عیاں کر دے، کچھ آسان نہیں، مگر فیضؔ کے یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند شاعری ہونے کے باوجود یہ مزاحمتی تہذیب نہ صرف باقی رہی ہے بلکہ تمام تر انفراد کے ساتھ چمک اُٹھی ہے۔ ❁❁

ممتحنہ اختر
Research Scholar, Kashmir University, Srinagar - 190006 (Mob. 9906439542)

ترقی پسند اردو تنقید میں موضوع و مواد کی تقدیم کا مسئلہ

شعر و ادب میں صرف موضوع اور مواد ہی نہیں بلکہ اسلوب اور ہیئت کی بھی خاص اہمیت ہے اور اس رُخ سے یہ کہنا غلط نہیں کہ فن و ادب کی گتھیوں کو سمجھنے اور پرکھنے کا مسئلہ محض مواد اور ہیئت کو سمجھنے کا مسئلہ نہیں بلکہ دونوں کی وحدت و یکسوئی سے اٹھنے والے حظ اور کیف و سرور اور اُن فکری و حسی تصورات و کیفیات کو سمجھنے کا مسئلہ بھی ہے جو مختلف النوع لطیف جذبات و احساسات کی آبیاری کرتے ہیں، لیکن ادبی تنقید میں مواد اور ہیئت کو مستقل طور پر وحدت کے لحاظ سے کبھی قبول نہیں کیا گیا یا یوں کہا جائے کہ مواد اور ہیئت کی وحدت ادبی تنقید میں مستقل معیار یا مستقل قدر کے طور پر کبھی قائم نہیں رہ سکی، بلکہ مختلف ادوار میں کبھی مواد اور کبھی ہیئت کو ادبی تخلیق کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے ملحوظ نظر رکھا گیا۔ ادب کو جب فن برائے فن یا تصوریت یا جمالیاتی قدروں کے معیار پر پرکھا گیا تو ہیئت پر سارا زور صرف کر کے مواد و موضوع کو پس پشت ڈال دیا گیا اور جب فن کی مقصدیت پر زور دیا گیا، سماجی عوامل سے اس کے رشتے کی اہمیت کو سامنے لایا گیا اور حقیقی و معروضی کائنات کی ترجمانی اس میں تلاش کی گئی تو مواد و موضوع ہی مقدم قرار پایا اور ہیئتی پہلو مفقود رہا۔ گویا مواد اور ہیئت کی ثنویت مختلف صورتوں میں مختلف حالات اور تصورات کے پیش نظر ادبی تنقید میں شروع سے قائم رہی۔

اردو ادب میں مختلف حالات اور جدید تہذیبی اثرات کے پیش نظر جب حقیقت پسندی کا رجحان سامنے آیا، ادب کے افادی اور مقصدی ہونے پر زور دیا گیا، سماج سے اس کے رشتے پر روشنی ڈالی گئی تو تنقید میں بھی ہیئت سے زیادہ مواد و موضوع ہی اہم قرار پائے۔

حقیقت پسندی کا یہ رجحان یوں تو سرسید تحریک سے شروع ہوا جس نے اردو تنقید میں ایک بالکل نئی روایت قائم کی۔ پہلے معیار ذوق اور وجدان کو سمجھا جاتا تھا، لیکن بعد میں اس تحریک نے سماجی قدروں اور اخلاقی قدروں کو ادب کا معیار قرار دیا۔ پہلے ادب محض جمالیاتی حظ ولذت اٹھانے تک محدود تھا، اس تحریک نے اس کے مقصدی وافادی ہونے پر زور دیا، لیکن سرسید تحریک سے جڑے یہ تمام تصورات کسی مخصوص نظریہ کی سطح پر سامنے نہیں آئے، نہ ہی ایک لازمی حقیقت کے طور پر سماج کے اقتصادی یا معاشی یا تاریخی عوامل کے پیش نظر ان تصورات کو اجتماعی سطح پر برتا گیا بلکہ اخلاقی و اصلاحی مقصدیت کے پیش نظر سماج کے ایک مخصوص طبقہ کے لیے حقیقت پسندی کے ان نظریات کو سامنے لایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کی افادیت کو تسلیم کرنے کے باوجود یا ادب کو زندگی یا سماج کا ترجمان ماننے کے باوجود اس میں ادب کے جمالیاتی اور فنی پہلوؤں کو بھی اہمیت حاصل رہی یا ادب پر جمالیاتی یا ادب برائے ادب کا نقطۂ نظر بھی کافی حد تک غالب رہا۔

اصل میں حقیقت پسندانہ تصورات کو باضابطہ اور منظّم طور پر برتنے کا سہرا ترقی پسند تحریک کے سر جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سرسید تحریک کی ترقی یافتہ شکل تھی جس نے باضابطہ اور منظّم طور پر ان اصول و قواعد پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی جو سرسید تحریک نے اردو ادب کے لیے اٹھائے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر ایک نظریہ کی حیثیت سے ترقی پسندوں نے سماجی اور معاشی عوامل کو ادب میں برتنے پر زور دیا۔

اس تحریک کی بنیاد چونکہ مارکس کے اشتراکی خیالات پر استوار تھی اس لیے سرسید تحریک کے مقابلے میں اس سے جڑے تمام تصورات ایک مخصوص نظریہ کی سطح پر سامنے آئے یا ایک لازمی حقیقت کے طور پر ان تصورات کو اجتماعی سطح پر برتا گیا، یعنی اس تحریک نے ادب کا تجزیہ مارکسی پیمانے کے پیش نظر سماجی، سیاسی اور تاریخی پس منظر میں افادی حیثیت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے کیا۔ اصل میں یہ ادب میں عالمی سطح پر یہ ایک مخصوص زاویہ نگاہ اور ایک نیا نقطۂ نظر تھا جس میں ادیب کے ذہن

اوران میں پیدا ہونے والے خیالات وتصورات کی اصلیت کوسماجی اور معاشی یامادی عوامل سے وابستہ قرار دیا گیا۔

مارکس کے بنیادی خیالات سے زمانہ واقف ہے، اس کا اساسی تصور یہ تھا کہ تمام افکار کی عمارت مادی عوامل یا معاشی حالات پر بنتی ہے، یہی خیالات کے بننے، بگڑنے اور ارتقائی مراحل طے کرنے کا سبب بنتے ہیں اور انہیں عوامل پر انسانی ارادے، ان کا شعور، ان کے عقیدے، تہذیب، تمدن، اخلاق، مذہب اور علوم وفنون کی عمارت بنتی ہے، اس لیے تمام تصورات کی تخلیق اوران کا ارتقا اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے دور کے معاشی زندگی کا عکس ہوتے ہیں۔

مارکس کے اسی تصوراتی تناظر میں فن ادب کے معاملہ سے جو بنیادی طور پر فن کار کے ذہن اوران میں پیدا ہونے والے افکار و خیالات سے وابستہ ہیں ان کے بارے میں یہ نقطۂ نظر اختیار کیا گیا کہ مادی عوامل یا معاشی حالات وکوائف ہی ادیب کے خیالات وافکار کی بنیاد قرار پاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ اس کی تخلیق کی پرکھ اپنے دور کے معاشی و مادی حالات کے پس منظر میں کی جائے۔ یعنی معاشی و مادی عوامل سے بننے والے جن سماجی حالات میں اس کے خیالات و افکار بنتے ہیں ان سماجی حالات کا بغور جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان حالات سے فن کار کے یہاں کیسا ادب خلق ہوا ہے اور یہی نہیں بلکہ سماج کے ایک رکن ہونے کی حیثیت سے فن کار سے یا اجتماعی ہیئت کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے یہ مطالبہ بھی اس سے کیا جائے کہ وہ اپنے دور کے سماجی ومعاشی حالات وکوائف کے پیش نظر اپنا ادب تخلیق کرے، ماؤزے تنگ نے اسی بات کے پیش نظر لکھا ہے کہ:

> ''مصنفوں اورادیب کو اپنے سماجی ڈھانچہ کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے، سماج جن طبقات پر مشتمل ہے ان کو بھی دیکھنا چاہیے اور پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ مختلف طبقات کا آپس میں رشتہ کیا ہے؟ مختلف طبقات کے حالات وکوائف ان کے انداز فکر اور ان کی نفسیاتی کیفیات کا شعور حاصل کرنا چاہیے۔'' (تنقیدی دبستان، سلیم اختر، بک کارپوریشن دہلی، ص۱۸۱)

ادبی تنقید کے اس نئے نقطۂ نظر نے چونکہ اپنی بنیادی غذا مارکس کے اشتراکی خیالات سے حاصل کی تھی، اس لیے ادب کے مطالعے کے لیے سماجی حالات، طبقاتی تقسیم اور تاریخ کے مادی عوامل کے جائزے کو نہ صرف ضروری قرار دیا گیا بلکہ فن وادب کی پرکھ کو لے کر حسن و جمالیات کا جو معیار سامنے آتا ہے اس کی بنیاد ہی مادی عوامل سے وابستہ قرار دی گئی اور یہ تصور اس کے سامنے لایا گیا کہ انسان میں جمالیاتی پہلو یا جمالیاتی شعور کوئی ابدی چیز نہیں ہے بلکہ جمالیات کے پیمانے مادی دنیا سے وابستہ ہیں۔ خوبصورت وہی چیز ہے جو معروض میں ہے نہ کہ موضوع میں، موضوع کی حیثیت معروض کے نزدیک ثانوی ہے یعنی شعور مادہ کے تابع ہے:

> '' جمالیاتی تصورات سماجی زندگی اور اس کی ساخت، تاریخی حالات اور طبقاتی جدوجہد کا نتیجہ ہوتے ہیں یہ محض مجرد تصورات نہیں ہوتے۔'' (مارکسی فلسفہ، اشتراکیت اور اردو ادب، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی، ص۱۲۶)

اس تعلق سے یہ بھی کہا گیا کہ مجرد، الٰہیاتی یا مابعد طبیعاتی تصورات گمراہ کن اور لغو ہیں ان کی کوئی حقیقت واصلیت نہیں۔

فن وادب چونکہ جمالیاتی اقدار کا حامل ہوتا ہے اس لیے جمالیات پر اس نئی توضیح نے ادبی تنقید میں بھی حسن وخوبصورتی کو سمجھنے اور جانچنے کے معیارات بدل ڈالے پہلے ادبی تنقید میں جمالیات کو لے کر یہ توضیح سامنے آتی تھی کہ حسن چونکہ عینی، ابدی اور مطلق حقیقت ہے اس لیے اس کی پہچان تشریح میں نہیں بلکہ محض اظہار میں ہے۔

مذکورہ توضیح کے بموجب فن وادب میں بھی محض اس کے اظہاری یا صوری و ہیئتی پہلو ہی اہم قرار پاتے ہیں۔ معنی ومواد کی تلاش بے معنی اور لغو ہے، مگر اب خوبصورت مجرد خیال یا عینی حقیقت کے بجائے ایسی ٹھوس حقیقت معیار نظر قرار پائی جو مارکسی جدلیت کے پیش نظر نہ تو جامد ہے اور نہ ہی انسانی زندگی سے علیحدہ کوئی شے ہے بلکہ جو متحرک اور تغیر پذیر ہے، جس کا تانا بانا انسانی زندگی یا سماجی تاریخ میں معاشی عوامل (یعنی اشیاء کی پیداوار تقسیم اور تبادلہ) سے بنتا ہے اس لیے ادب میں بھی اسی ٹھوس حقیقت اور انہی مادی عوامل کی ترجمانی ہونے لگی

اور یہ بات بھی اہم قرار پائی کہ ادب میں حسن یا خوبصورتی کو انسانی عوامل اور طبقاتی جدوجہد میں تلاش کیا جائے اور ایک خاص مقصدیت کے پیش نظر ان غریب اور مزدور طبقہ کی حمایت کی جائے جو مارکس کے نزدیک معاشی تاریخ کی جدلیت میں انقلاب اشتراکیت اور آخری منزل کے موجب ہیں۔ظاہر ہے کہ تاریخ کی جدلیت اپنا ایک خاص مفہوم رکھتی ہے جس کی تفصیل میں جانا یہاں ممکن نہیں۔البتہ اتنا ضرور اشارہ ہوسکتا ہے کہ اس طرح ادبی تنقید میں حسن کے اس نئے تصور نے فنی تکمیلیت کے احساس کو ایک نیا وژن دیا اور یہ نیا نقطہ نظر اختیار کیا گیا کہ فنی تکمیلیت کا احساس محض فن کار کے فنی لوازمات یا ہیئتی پہلو کے احسن طریقے سے برتنے پر نہیں ہوتا بلکہ اس چیز سے ہوتا ہے کہ دنیا کی ٹھوس اور متحرک حقیقتوں کو اس نے کس طرح دیکھا، پرکھا اور جانا ہے اور کس مقصدیت کے تحت اجتماعی سطح پر ادبی تخلیق میں برتا ہے، بقول وہاب اشرفی:

> ''داخلیت اور خارجیت کے ناگزیر وصل کے آخری مرحلے میں خوبصورت وہی چیز ٹھہرتی ہے جس کا معروضی وجود ہو اور جو سماجی تاریخ میں اہم نکتہ بن کر ابھرے۔''
>
> (مارکسی فلسفہ، اشتراکیت اور اردو ادب، ص ۱۲۶)

چنانچہ مارکس اور لینن کے خیالات کی توضیح اس کے پیش نظر کچھ اس طرح سامنے آتی ہے کہ:

> ''خوبصورتی اور رسودمندی الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ دونوں کا باہمی ربط ہے جسے واضح طور پر سمجھا جاسکتا ہے، اس لیے محض خوبصورت نظر آنا خوبصورتی کی نشانی نہیں ہے بلکہ خوبصورتی کے پیچھے اصلی رنگ وروغن کیا ہے، اس کی دریافت حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔''
>
> (مارکسی فلسفہ، اشتراکیت اور اردو ادب، ص ۱۲۷)

جمالیات پر مارکسی نظریات کی اس توضیح نے ادب کے انفرادی، صوری و ظاہری پہلو کے برعکس اس کے معنوی، عملی، افادی اور اجتماعی پہلو کی اہمیت کو سامنے لایا۔ظاہری بات ہے کہ مارکس کا مادی فلسفہ جن بنیادوں پر کھڑا تھا ان بنیادوں کا یہ تقاضا تھا کہ ادب میں ہیئتی وصوری پہلو کے برعکس معنی ومواد اور ان سے جڑے متعلقات یعنی افادیت، اجتماعیت، حقیقت پسندی اور مقصدیت کو اہمیت دی جائے۔

یہی وجہ ہے کہ ظاہری حسن یا ہیئت پسند یا انفرادی سوچ رکھنے والوں کے پیش نظر مارکسی تنقید میں یہ خیال سامنے لایا گیا کہ ادب میں انفرادی طریقہ کار انفرادی ذہنیت کو ہوا دیتی ہے جو انسان میں خود پرستی اور بورژوا یا سرمایہ دارانہ خیالات کی جنم داتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ انفرادی طریقہ کار اختیار کرنے کے بجائے اجتماعی طریقہ کار اور خیالات کو برتا جائے کیونکہ جس طرح مارکس کے نزدیک اجتماعی یا اشتراکی پیداواری محنت سے خود غرضی یا انفرادی ذہنیت کے بجائے اجتماعی اور انسان دوستی کی ذہنیت پیدا ہوتی ہے اسی طرح مذکورہ مباحث کو مختصر لفظوں میں یوں بھی سمیٹا جاسکتا ہے کہ ادب کے اجتماعی کردار سے ادیب کے اندر پورے سماج کے ساتھ وابستگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

زندگی کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کا وہ حل جو مارکسی تصورات سامنے لائے تھے، ان کے اثرات زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب پر بھی مرتب ہوئے، خاص طور پر سامراجیت، جبریت اور غلامی کی گرفت میں گرفتار ممالک کے ادب نے ان اثرات کو ترجیحی طور پر قبول کیا اس لیے جب ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کا آغاز ہوا تو اس سے جڑے ادیبوں اور ناقدوں نے اسے اپنے ملک سے جڑے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور برطانوی سرمایہ داری کی سخت گیریوں کے حل کے طور پر نہ صرف قبول کیا بلکہ انہوں نے اپنی تحریک کو دنیا میں ترقی پسند تحریک کے ایک جزو کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ احتشام حسین نے انہیں پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''ہندوستانی ترقی پسند تحریک دنیا میں ترقی پسند کی تحریک اشتراکیت کے اصول کے پرچار، فاشزم کے خلاف تمدنی اور ادبی محاذ قائم کرنے کی عام تحریک کا ایک حصہ ہے، اسے ان تحریکیوں کے ایک جزو کی حیثیت سے سمجھنا چاہیے۔'' (تنقیدی جائزے، حیات پبلشرز لکھنو، ص ۳۳)

اس لیے ترقی پسند ادبی تنقید میں بھی ادب اور جمالیات پر مارکس کے خیالات کی توضیحات کو لے کر یا مارکس کے بنیادی تصورات کے اثرات کو لے کر یہ خیالات سامنے آئے کہ ترقی پسند ادب چونکہ عوامی جدوجہد یا

سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ایک حصہ ہے اس لیے اس کی زبان عوام کی ذہنی سطح سے ہم آہنگ ہونی چاہیے اور یہ کہ:

''جو ادب اس سطح سے بلند ہو کر رمزیت واشاریت کا پیرایہ اختیار کرے گا اس کی ترقی پسندی مشکوک ہوگی۔ رمزیت واشاریت ہیئت پرستی ہی کی شکل ہے اور اب یہ ان ادیبوں کا مسلک سمجھی جاتی ہے جو انحطاط پذیر سرمایہ دارانہ نظام کے پروردہ ہیں۔'' (اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمان اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص ۳۸۷)

مارکس کے تصورات ترقی پسندوں کا منشور بن کر سامنے آتے ہیں جو یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ادب کو انفرادیت، خود پسندی، بے جا طرف داری، اجنبیت پسندی، دقت پسندی، قدامت پرستی، تصور پرستی، غیر عقلی وغیر حقیقی رجعت پرستی اور نسلی وتعصبی روایات وتصورات سے نکل کر حقیقی ومعروضی اور تغیر پذیر انسانی سماج کی ترجمانی کرنی چاہیے اور سماج کے اس طبقہ کی حمایت کرنی چاہیے جو تغیر اور انقلاب کا موجب ہے، چنانچہ اسی منشور اور حکم نامے یا انہی خیالات کے پیشِ نظر پریم چند نے سب سے پہلے ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کل ہند کانفرنس کے صدارتی خطبے میں ہیئت پر مواد کی تقدیم اور اہمیت کو سامنے لاتے ہوئے یہ خیالات پیش کیے:

''زبان ذریعہ ہے منزل نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کر لی ہے کہ ہم زبان سے گزر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پورا ہو۔ وہی زبان جس میں ابتداً 'باغ وبہار' اور 'بیتال پچیسی' کی تصنیف معراجِ کمال تھی اب اس قابل ہو گئی ہے کہ علم وحکمت کے مسائل بھی ادا کرے......ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا......(پہلے) آرٹ نام تھا محدود صورت پرستی کا، الفاظ کی ترکیبوں کا، خیالات کی بندشوں کا، زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں، زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں......
اب ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔'' (اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمان اعظمی، ص ۴۴ تا ص ۴۵)

یہاں یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ آرٹ کو افادیت کے میزان پر تولنے کے پیشِ نظر پریم چند کے یہ سارے خیالات اصل میں مواد وموضوع کی اہمیت کو لے کر ہی سامنے آئے۔

اصل میں ترقی پسند ادبی تحریک یا ادب میں عالم گیر سطح پر پھیلی مارکسی تنقید میں مواد وموضوع کے براہ راست یا ادبی نقطۂ نظر سے مطالعہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی یا اس طرح کہیں کہ ہیئت سے زیادہ مواد وموضوع ہی کی تقدیم اور اہمیت کو سامنے لانا مقصود محض نہیں تھا، بلکہ اس تحریک سے جڑے مارکس کے بنیادی مادی تصورات زندگی، سماج، حقیقت اور فطرت سے جڑے جن تقاضوں یا جن دعووں کو لے کر سامنے آئے تھے، ان تقاضوں کی یہ ناگزیریت یا ضرورت (Necesity) بھی تھی کہ ادب میں مواد وموضوع ہی کی اہمیت کو لازمی قرار دیا جائے، اس لیے اس تحریک سے جڑے بعض ناقدین نے اگرچہ مواد اور ہیئت دونوں کی اہمیت یا دونوں کے ناگزیر وصل کو لازمی قرار دیا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ ادب میں فنی وادبی پہلو کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جتنی مواد وموضوع کو، لیکن مجموعی حیثیت سے اس تحریک پر مواد وموضوع ہی کی اہمیت غالب رہی بلکہ اس تحریک کے اولین منشور کے تحت معاشی بدحالی، یعنی بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے استحصال کو ختم کرنے کا جو مقصد سامنے آیا تھا اس نے اس تحریک کی ادبی جہت میں سیاسی پہلو کو زیادہ ہوا دے کر ادبی وفنی قدروں کو بہت حد تک دبا دیا اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی جب جماعتی نصب العین یا اس کے منشور یا حکم نامے کے مطابق شعر وادب کی تصنیف کرنے پر زور دیا گیا یا ادب میں انفرادیت کے بجائے اجتماعی خیالات کی ترجمانی کرنے کی تاکید کی گئی تو اسلوب، انداز بیان یا ہیئتی پہلو کے بجائے مواد وموضوع ہی اہم قرار پائے۔

❁❁❁

افسانے

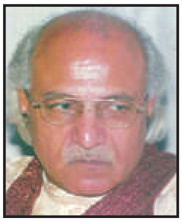

ڈاکٹر نریش
169, Sector - 17, Panchkola - 134109

تصادم

پرمود کے کیبن میں قدم رکھتے ہی راکیش نے پوچھا:

''کہئے، کس لئے یاد کیا مجھ کو......؟''

''تم میرے جگری دوست ہو۔ میں نے تم سے کبھی کوئی پردہ نہیں رکھا۔ میری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح تمہارے سامنے ہے۔''

''اصل مدعے پر آؤ'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے راکیش بولا:

''یار، کل اس کا بھائی آیا تھا۔''

''کس کا......؟''

''روبی کا......''

''تو......؟''

''وہ روبی کی شادی کا پیغام لے کر آیا تھا۔''

''تم نے کیا کہا......؟''

''میں نے کہا سوچنے کے لئے وقت چاہئے۔''

''تو کیا سوچا تم نے......؟''

''رات بھر سوچتا رہا ہوں۔ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا ہوں، اس لئے تم سے مشورہ کر رہا ہوں۔''

''سوچ لیا ہو تو بس فوراً ہی ہاں کر دو...... وہ تم کو پسند ہے......تم اسے چاہتے بھی ہو......''

''مگر، اس کی پاکیزگی کا یقین کئے بغیر کیسے ہاں کہہ دوں؟''

''پاکیزگی......؟'' زوردار قہقہہ لگایا راکیش نے۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ میں نے سنا ہے اس کے کئی لڑکوں کے ساتھ تعلقات ہیں۔''

''ہو سکتے ہیں...... وہ افسانہ نگار ہے۔ ادبی نشستوں میں شریک ہوتی ہے۔ کچھ ساتھی ادیبوں کے ساتھ دوستی ہو گئی ہوگی۔''

''دوستی تک تو بات ٹھیک ہے...... بات کچھ آگے بڑھی ہونے کے بارے میں بھی سنا ہے۔''

''اگر وہ تمہیں پسند ہے تو کیسی بھی ہو، تمہاری بیوی بن کر تو وہ تمہیں کو وقف ہوگی۔''

''کیا وقف ہوگا، جسم یا روح؟''

''تمہیں شک ہے کہ اس کے کسی دوسرے لڑکوں کے ساتھ مراسم ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری اطلاع غلط ہو۔ غلط نہ بھی ہو، یہ کیا ضروری ہے کہ اس کا کسی کے ساتھ جسمانی تعلق ہو۔ ہو بھی تو کیا مضائقہ ہے۔ تم اپنے کو دیکھو، کتنی لڑکیوں کے ساتھ تمہارا تعلق رہا ہے۔ ان کے ساتھ بوس و کنار کر کے یا کچھ ایک کے جسم کا استحصال کر کے تم نے ہر کسی کو چھوڑ دیا۔ جب تمہارا دل کسی چیز سے بھر جاتا ہے تم اس کو ترک کر دیتے ہو۔''

''لیکن جس کے ساتھ زندگی بھر کا رشتہ بنانا ہے، جس کو اپنی شریک حیات بنانا ہے، وہ تو میری ہونی چاہئے، صرف اور صرف میری......''

''یعنی بیل کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ چاہے جس ناند میں منھ مارے، گائے کو اپنی ناند سے باہر جھانکنے کا حق نہیں ہے۔''

''یہ بات نہیں راکیش، کچھ کہتے نہیں بن رہا تھا پرمود سے۔''

''دیکھو، ہر گائے دُہا جانا چاہتی ہے۔ اسے نہ دُہا جائے تو وہ دکھی ہوتی ہے، ربھاتی ہے۔ دوہنے والا ہاتھ کس کا ہے یہ وہ نہیں دیکھتی۔ روبی نے اپنے دوہن کے لئے تمہارا ہاتھ چنا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی چنا ہوگا اور ایک بات اور ذہن میں رکھو۔ گائے جب کسی دوہنے والے کے ہاتھ کی عادی ہو جاتی ہے تو وہ کسی دوسرے کو اپنے تھنوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی، پچھاڑ مارتی ہے۔''

''لیکن...... سہاگ رات میں میں اپنی دلہن کے باسی ہونٹ تو نہیں چوم سکتا۔''

راکیش نے ایک گہری سانس لی۔

''پرمود، پہلی بات تو یہ کہ تمہیں اس کے ہونٹوں کے باسی ہونے کا اندیشہ ہے، یقین نہیں ہے۔ دوسری بات، کیا تمہارے اپنے ہونٹ باسی نہیں ہیں؟ اس کے ہونٹوں کو تو شاید کسی ایک آدھ مرد کے ہونٹوں کا لمس حاصل ہوا ہو، تم تو کتنی ہی معشوقاؤں کے ہونٹوں کا لمس ڈھوتے آرہے ہو۔''

پرمود کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا، ایک جارہا تھا، جو گفتگو اس کی اس وقت راکیش سے ہو رہی تھی، یہی گفتگو اگر آئینے کے سامنے اس کی خود کے ساتھ ہوئی ہوتی تو وہ بھی سو فیصد یہی رہی ہوتی۔

راکیش اُٹھ کھڑا ہوا: ''چلتا ہوں، آفس میں کچھ کام پڑا ہے۔ تمہارے بلانے پر درمیان میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ تم سوچ لو، غور و فکر کرلو، اپنا پڑھا لکھا سمجھ لو۔ آفس کے بعد پھر آتا ہوں۔''

راکیش کے جانے کے بعد وہ اپنا فیچر لکھنا چاہتا تھا، لیکن ایک لفظ بھی نہیں لکھا جا رہا تھا اس سے۔ دماغ پیچھے کی طرف دوڑ رہا تھا، ماضی کی تہیں کھولنے کو بیقرار تھا۔

ایم۔اے پاس کرتے ہی اسے مقامی اخبار میں ملازمت مل گئی تھی۔ ایم۔اے کے دنوں میں وہ اس اخبار کو اپنی تخلیقات بھیجتا رہا تھا، جو چھپتی رہی تھیں۔ کئی مہینے تک خبروں کی سیٹنگ کرنے کے بعد اسے ایک ہفتہ وار کالم مل گیا تھا، جسے وہ مکمل انہماک کے ساتھ لکھ رہا تھا۔ اس کی صلاحیت رفتہ رفتہ اپنا رنگ دکھانے لگی تھی۔ تھوڑا بہت نام بھی ہو گیا تھا۔

روبی اس وقت ایم۔اے کے آخری سال کی طالبہ تھی۔ اس کو کہانی لکھنے کا کیڑا کاٹ گیا تھا۔ اس نے اپنی تین چار کہانیاں اپنے ٹیچر کو دکھائیں۔ ٹیچر کا ادب کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ اس نے کہانیاں پڑھ ضرور لی تھیں، مگر وہ ان سے متعلق کیا رائے دے سکتا تھا۔ اس نے صاف لفظوں میں روبی سے کہا تھا:

''بیٹا، مجھ کو ادب کی سمجھ نہیں ہے۔ اقتصادیات سے متعلق کوئی مضمون ہو تو کوئی مشورہ دے سکتا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم کسی اچھے قلمکار کو اپنی کہانیاں دکھاؤ۔ اس کے مشورے پر عمل کرو۔''

''قلم کار......؟'' سوچنے لگی روبی۔

''میں نے ایک آدھ بار پرمود سری واستو کا کالم پڑھا ہے۔ اچھا لکھتا ہے، اس سے بات کر کے دیکھ لو۔''

شکریہ ادا کر کے روبی ٹیچر کے کمرے سے باہر آ گئی۔

اگلے روز ڈرتے ڈرتے، لجاتے لجاتے وہ اخبار کے دفتر گئی:

''پرمود جی کہاں بیٹھتے ہیں؟''

''پانچویں کیبن میں......''

اس نے پانچویں کیبن پر ہلکی سی دستک دی اور اندر چلی گئی۔ پرمود لکھنے میں مصروف تھا۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے روبی کو بیٹھنے کے لئے کہا اور لکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد قلم میز پر رکھ کر اس نے روبی کا طرف دیکھا:

''فرمائیے......''

''جناب میرا نام روبی ہے۔ میں یونیورسٹی میں فائنل ایر میں پڑھتی ہوں۔ مجھے کہانیاں لکھنے کا شوق ہے۔ اسی سلسلے میں آپ سے رہنمائی کی گزارش کرنے حاضر ہوئی ہوں۔''

''پرمود نے غور سے روبی کو دیکھا۔ کیا نہیں تھا اس لڑکی میں۔ گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، گھنگھرالے بال، صراحی دار گردن، دعوت سی دیتے ہوئے ہونٹ، چھریرا بدن، اس کے حسن پر فدا ہو گیا پرمود۔

''میں ہر نئی صلاحیت کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ آپ کی صلاحیت کو نکھارنے سنوارنے میں مجھے خوشی ہوگی۔ لائیے دکھائیے کیا لکھا ہے۔''

روبی اپنی چار کہانیاں فائل کور میں رکھ کر لائی تھی۔ احساسِ تشکر کے ساتھ اس نے فائل کو اس کی طرف بڑھا دیا۔

''میں ان کو رات میں پڑھ لوں گا۔ آپ کل اسی وقت آجایئے۔''

وہ اس کے کیبن سے چلی گئی تھی، مگر پرمود بڑی دیر تک اپنے آس پاس اس کے جسم کی خوشبو کو محسوس کرتا رہا تھا۔ بہت اچھی لگی تھی اس کو یہ لڑکی۔ اس سے قبل بھی اس کا کئی لڑکیوں سے سابقہ پڑا تھا۔ ہر لڑکی ہی اچھی لگی تھی اس کی شہوت پسند نظروں کو۔ ہر لڑکی کو اس نے کسی نہ کسی بہانے سے اپنے قریب لا کر کسی کو چھو کر، کسی کو چوم کر، کسی کو سینے سے لگا کر اور کسی کا جنسی استحصال کر کے چھوڑ دیا تھا اور ہر بار کسی نئے شکار کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔

لیکن روبی ان تمام لڑکیوں سے مختلف تھی۔ معلوم نہیں ایسا کیا تھا روبی میں کہ اس کو دیکھ کر پرمود کی رال نہیں ٹپکی تھی۔ وہ اس کو جاننا

چاہتا تھا، سمجھنا چاہتا تھا۔ پہلی مرتبہ اس کے خیال میں آیا تھا کہ جسم کی کشش سے آگے بھی کچھ ہوتا ہے، جو کہانیاں روبی اس کو پڑھنے کے لئے دے گئی تھی، ان میں بھی اس کی تخلیقیت نے جسم اور روح کی گتھی سلجھانے کی غیر مشاقانہ کوشش کی تھی۔

اگلے روز وہ آئی تو پرمود نے بزرگوں جیسا سلوک کرتے ہوئے اسے ایسی اچھی کہانیاں لکھنے پر شاباشی دی اور کچھ ترامیم تجویز کیں۔ روبی باغ باغ ہوگئی تھی۔

''ترمیم کرکے ان کو پھر سے لکھو، مجھے دکھالینا پھر ایک بار۔''

''جی بے حد شکریہ......!'' کہہ کر وہ جانے کو ہوئی تو پرمود نے اس کو روک لیا: ''آج افسانہ نگار روبی کو میں بغیر چائے پلائے کیسے جانے دے سکتا ہوں۔'' اس نے گھنٹی بجائی اور لڑکے سے چائے لانے کے لئے کہا۔

چائے آنے تک اور چائے پیتے وقت اس نے روبی کی کہانیوں کے حوالے سے جسم اور روح والا موضوع چھیڑ لیا۔

''تم کیا سمجھتی ہو روح اور جسم دو الگ الگ چیزیں ہیں؟''

''جی ہاں۔'' روبی کا تامل آج قدرے مفقود تھا۔

''جسم کسی دوسرے کو اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ اس سے تعلق بنانے کی، اس کا لمس پانے کی، اس کے قریب رہنے کی آرزو کو جنم دیتا ہے۔ کئی بار یہی کشش شادی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد مرد کے اندر کا روایتی مرد بیدار ہوجاتا ہے۔ وہ عورت سے مکمل عقیدت، مکمل سپردگی چاہتا ہے۔ سپردگی میں عورت اس کو اپنا جسم دے دیتی ہے، اس کے بچے پیدا کردیتی ہے، لیکن اس کی روح تشنہ رہتی ہے۔ وہ جو مساوی حق چاہتی ہے، جو بھرپور محبت چاہتی ہے، جب اس کو نہیں ملتی تو وہ ٹوٹنے لگتی ہے اور آخر کار ٹوٹ جاتی ہے۔''

خطبہ سا ہی دے ڈالا تھا روبی نے، پرمود محو ہوکر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اُٹھ کر کیبن کی کنڈی لگائے اور روبی کو باہوں میں بھر کر چوم لے، مگر یہ ممکن نہیں تھا۔

رفتہ رفتہ اس نے روبی کو ملنے کے لئے کسی نہ کسی پارک میں، کسی نہ کسی ریستوراں میں بلانا شروع کردیا۔ اس کی ایک کہانی اپنے اخبار کے سنڈے میگزین میں شائع کردی۔ روبی کے احساسِ تشکر میں اضافہ ہوگیا۔ ہوتے ہوتے پرمود رہنما کی جگہ پر دوست معلوم پڑنے لگا۔ وہ اس کے سامنے کھلتی گئی، اس کو گرویدہ کرتی رہی، گفتگو ادب کے دریچے میں سے اتر کر حقیقت کے فرش پر آگئی اور ''دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی'' والا معاملہ ہوگیا۔ مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔

پرمود چاہتا تو اپنے گزشتہ تجربات کی بنا پر اب تک اس کو چھو کر یا بھوگ کر دوسری لڑکیوں کی طرح ترک کرسکتا تھا، لیکن اس نے روبی کو نہ چھوا، نہ بھوگا۔ ایک عجیب قسم کی جاذبیت تھی جو اس کو غرق کئے دے رہی تھی۔ اس کے اپنے اندر بھی کہیں جابجا بھٹکنے کی ذہنیت کو لگام لگانے کا خیال پیدا ہوگیا تھا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ لڑکی میرے اندر کے خلا کو پر کرسکتی ہے۔ زندگی بھر ازدواجی آسودگی کے ساتھ ساتھ انہماک، تسکین اور اتمام عطا کرسکتی ہے، لیکن اس کے لئے یہ یقین کرنا لازمی تھا کہ شادی کے بعد وہ اپنی محبت اس کے اور کسی دوسرے کے درمیان تقسیم تو نہیں کرے گی۔ خفیہ طور پر اس نے اپنے چند معتبر آشناؤں کے ذریعے روبی سے متعلق معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ وہ کئی لڑکوں کے ساتھ دوستی کرچکی ہے۔

پرمود احتمال اور جاذبیت کے بیچ ہمیشہ ہی جھولنے لگا تھا۔ جس لاشریک غیر اختیاری آرزو اس کے سنسکار نے دے رکھی تھی، اس کسوٹی پر کھری اترتی دکھائی نہیں دے رہی تھی روبی۔ وہ ابھی اسی تذبذب میں غرقاب تھا کہ روبی کا بھائی اس سے ملنے آیا اور شادی کی تجویز پیش کرگیا۔

''سوچنے کے لئے وقت چاہئے'' سن کر روبی کو دھکا سا لگا تھا، لیکن اس نے سوچا کیا مضائقہ ہے، زندگی بھر کا ساتھ ہے، سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا جانا چاہئے۔

پرمود جتنا سوچتا جاتا تھا اتنا ہی اس کے اندر سنسکار اور حیاتِ معاشقہ کے درمیان تصادم بڑھتا جاتا تھا۔ راکیش اس کا بہترین دوست تھا۔ راکیش سے اس نے کبھی کچھ چھپا کر نہیں رکھا تھا، اسی لئے اس سے مشورہ کر رہا تھا۔ شام کو راکیش پھر آیا تو بغیر کسی تمہید کے اس نے کہا:

(بقیہ ص ۶۸ پر)

ارشد منیم

"Madina Basti" Raikot Road, Maler Kotla -148023 (Punjab) (Mob.9417159225)

مدعا

فلم ایکٹرس شردھا اپنے کمرے میں بیڈ پر اوندھی لیٹی میگزین کے اوراق الٹ پلٹ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے جھنجھلا کر میگزین ایک طرف پھینک دیا اور غصہ سے بولی:

''سالا حرامی......''

پھر وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنی خوب صورت ٹانگوں کو سیدھا کر کے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں جیسے تلاش کر رہی تھیں وہ سگریٹ کا پیکٹ، بیڈ کے دوسرے کونے پر پڑا تھا۔

اپنے کھلے بالوں کو سمیٹ کر اس نے پونی ٹیل بنائی اور ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کا پیکٹ اٹھا لیا۔ ایک سگریٹ نکال کر اپنے نازک ہونٹوں میں دبا کر سلگا لی، ایک لمبا کش کھینچ کر دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے اپنے آپ ہی بڑبڑائی:

''یہ ڈائریکٹر کا بچہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔؟ کوئی بات نہیں ایک دن میرا ٹائم بھی آئے گا......پھر اس کمینے کو سبق سکھاؤں گی۔''

آنکھیں بند کر کے اس نے سگریٹ کے لگاتار کئی کش لگا کر دھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑتے ہوئے اپنے اندر ابل رہے غصہ کے لاوا کو جیسے پرسکون کرنے کی کوشش کی، تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ شردھا آنکھیں بند کئے ہوئے بولی:

''کون......؟''

''روپا......''

''اوہ......تم......کم ان......دروازہ کھلا ہے۔''

اتنا سنتے ہی شردھا کی دوست روپا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں پولیتھین تھا۔ وہ بیڈ پر بالکل شردھا کے قریب بیٹھ گئی۔ شردھا آدھے سے زیادہ جلے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے تھکے تھکے سے لہجہ میں بولی:

''روپا، اچھا ہوا تم آ گئی، میرا موڈ بہت خراب ہے اور سر میں بھی درد ہو رہا ہے، اب تم سے باتیں کر کے تھوڑا فریش ہو جاؤں گی۔''

روپا نے پولیتھین میں سے بیئر کی دو بوتلیں نکالیں، ایک بوتل شردھا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی:

''میں تو تمہاری شوٹنگ سائٹ پر گئی تھی۔ وہاں سے پتہ چلا تم گھر چلی گئی ہو۔''

شردھا بیئر کی بوتل پکڑتے ہوئے بولی:

''یہ تم نے اچھا کام کیا......بہت دل چاہ رہا تھا پینے کو......''

روپا بیئر کا ڈھکن کھولتے ہوئے بولی:

''مجھے تمہاری حالت کا اندازہ تھا، اسی لئے لائی ہوں۔''

شردھا دو سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر سلگائے، دونوں کا ایک ساتھ کش کھینچنے کے بعد ان میں سے ایک سگریٹ روپا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی:

''اچھا......''

روپا سگریٹ پکڑتے ہوئے بولی:

''ہاں......کیونکہ جب میں تمہاری شوٹنگ دیکھنے کے لئے پہنچی تو وہاں سے پتہ چلا کہ تمہارا ڈائریکٹر کے ساتھ جھگڑا ہو گیا اور تم شوٹنگ چھوڑ کر گھر چلی آئی ہو......''

شردھا خفگی سے بولی:

''ٹھیک سنا تم نے، ہاں میرا اس کمینے سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ جس وجہ سے میں نے اب فلم چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے۔''

''کیا......؟......فلم......چھوڑنے کا ارادہ ہے......؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ ابھی اتنی بڑی ہیروئن نہیں بنی جو تم یہ نخرے دکھاؤ......پہلی فلم ہے تمہاری اور وہ بھی اتنے بڑے ڈائریکٹر کے ساتھ۔ بھول گئی

(بقیہ ص ۶۸ پر)

منظومات

افسر جمال افسؔر
Phulwarisharif, Patna - 801505 (Mob. 9631577374)

نعت پاک

فیض کا دریا رواں جس جا ہے وہ دَر آپ کا
جس کے دم سے یہ جہاں روشن ہے وہ گھر آپ کا

صرف جالی کی زیارت سے نہیں ملتا سکوں
دیکھ پاتے کاش ہم روضہ منور آپ کا

جس کے ہیں مرہونِ منّت ماہ و اختر ، آفتاب
اے مرے آقا وہ چہرہ ہے منور آپ کا

خوش کلامی میں کوئی بھی آپ کا ثانی نہیں
لہجہ و طرزِ بیاں مثل گل تر آپ کا

جو کبھی مکہ کی دھرتی سے اٹھا تھا انقلاب
ہے یقیں پہنچے گا وہ پیغام گھر گھر آپ کا

محسن انسانیت ہیں آپ محبوبِ خدا
ایک عالم ہے مرے آقا ثنا گر آپ کا

جان جائے کہ رہے حق بات کہنا ہے مجھے
ڈر نہیں سکتا کسی سے یہ قلندر آپ کا

گر چہ مشکل کی گھڑی ہے پھر بھی کوئی غم نہیں
آپ ہیں سالارِ لشکر ، سایہ سر پر آپ کا

ہے یہی حسرت مری، دل کی یہی ہے آرزو
آئے جب وقت نزع کلمہ ہو لب پر آپ کا

ہیچ ہے دنیا کی لذت ، ہیچ سب عیش و طرب
رشک جنت ہے ہمارے واسطے دَر آپ کا

کاش افسؔر کو وہ حاصل ہو کمالِ شعر و فن
شعر میں ختم رُسل! ڈھالوں میں پیکر آپ کا

❀❀❀

نعتیہ رباعیاں

ہر چند محمد ہے مدینہ کا مقیم
بیٹھا ہوا تسخیر کرے ہفت اقلیم
اعجاز کروں اس کا بیاں کیا جوششؔ
جو ایک اشارے میں کرے مہہ کو دو نیم

❀❀❀

(جوششؔ عظیم آبادی)

کس منھ سے کہوں مزے عجب ملتے ہیں
جو لطف حلاوت کے ہیں سب ملتے ہیں
آتا ہے زباں پہ جب محمد اک بار
دو بار آپس میں لب سے لب ملتے ہیں

❀❀❀

(شفقؔ عمادپوری)

انسان نے جو یہ رتبہ عالی پایا
آدم نے جو یہ وصف جمالی پایا
جس نورِ حقیقت کے یہ سب پرتو ہیں
وہ حسن محمد نے کمالی پایا

❀❀❀

(فلسفیؔ عظیم آبادی)

سلطان احمد ساحلؔ

Nohsa Main Road, Flat No. D-2, 2nd Floor, Jawahar Complex, Near Zamzam Store
Phulwarisharif, Patna - 801505 (Mob. 9135707097)

بے سمت رفتارِ زندگی

میرے گھر کے سامنے
ہر وقت انجن اور ریل گاڑیوں کا
شور شرابہ رہتا ہے
کبھی اِدھر کبھی اُدھر
اُن انجنوں اور گاڑیوں کی
چھک چھک کے ساتھ
پھک پھک کی صدائیں بھی گونجتی رہتی ہیں
صبح سویرے میری طائرانہ نظریں
جب تعاقب کرتی ہیں تو
دھندلکے میں انجنوں کے منھ سے
گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا نظر آتا ہے
اور گدلے آسماں کی جانب
موٹے موٹے ہیولے کی طرح
اُٹھتا دکھائی دیتا ہے
بھاپ کے بڑے بڑے مرغولے بھی
ایک زور اور شور کے ساتھ
فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں
پھر کبھی کبھی جب میں گاڑی کے
کسی کٹے ہوئے ڈبے کو
جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے
اُسے اکیلے پٹریوں پر
دوڑتا، بھٹکتا دیکھتا ہوں
تو میں سوچتا ہوں
کہ مجھے بھی کسی نے
زندگی کی پٹری پر دھکا دے کر
چھوڑ دیا ہے
اور میں خود بخود
اپنی منزل کی طرف گامزن ہوں
ساتھ ہی زندگی کے کیل کانٹے
بدلنے میں مصروف ہوں
اور میں چلا جاتا ہوں
انجان راہوں کی جانب
نہ جانے کہاں؟
پھر اک دور ایسا بھی آئے گا
جب دھکے کا زور
کمزور ہو جائے گا
کہیں رُک جائے گا
کسی ایسے اَنجان مقام پر
کسی ویران نگر میں
جہاں سے فرار تو کیا
پلٹنا بھی مشکل ہے

❁❁❁

غزلیں

نفیسؔ خیرآبادی

"Ganga Ram Colony" Hari Nagar, B.A.R.Bakery,
Gali No.1, H.No. G-42, Panipat, Haryana - 132103
(Mob. 8397831185)

گہرا تھا جس کے ساتھ تعلق یقین کا
وہ آ رہا ہے دھو کے لہو آستین کا

ہوتی ہے آسماں کی بلندی اُسے نصیب
کرتا ہے احترام جو دل سے زمین کا

لب سی رہا ہوں بیٹھا ہوا تا کہ عمر بھر
آئے نہ اُن پہ نام بھی پردہ نشین کا

الجھا کے خود کو بدعت کذب و نفاق میں
نادان رہ گیا ہے نہ دنیا نہ دین کا

ٹکتی نہیں ہے دوسری صورت نگاہ میں
جس دن سے چہرہ آن بسا اُس حسین کا

پاگل ہوئی ہیں فتنہ و شر کی جو آندھیاں
یہ امتحاں ہے شمع وفا کے امین کا

نکلا وہ ایسا گھر سے کہ یادوں کی شکل میں
کچھ رہ گیا ہے خانۂ دل میں مکین کا

جس کو فلک شگاف بصیرت ملی نفیسؔ
محتاج وہ کبھی نہ رہا دوربین کا

❁❁❁

صدام غنی

Makan No. 13, Cross Road No. 3, Azad Nagar, Maango
Jamshedpur - 831012 (Mob. 9631832842)

مرا ساقی کوئی مجھ سے خطا ہونے نہیں دیتا
پلاتا ہے مگر تھوڑی ، نشہ ہونے نہیں دیتا

حسیں بھی ہے وہی اور حسن کا مالک بھی ہے، لیکن
وہ اپنے حسن کو جلوہ نما ہونے نہیں دیتا

بچھڑنا ، بھولنا ، کم یاد کرنا ، سب کیا ، لیکن
وہ میرے ذہن سے خود کو جدا ہونے نہیں دیتا

وہ ظالم حکمراں جس کا لبادہ مہربانی ہو
زمانہ ایسے لوگوں کو خدا ہونے نہیں دیتا

مرض میں مبتلا ہونا گوارا ہے مجھے ، لیکن
کسی مانگی ہوئی شے کو دوا ہونے نہیں دیتا

دلِ بسمل دعائے خیر مانگے بھی تو کیا مانگے
تڑپ کی آرزو کو وہ فنا ہونے نہیں دیتا

چمن میں زیب و زینت مختلف رنگوں سے باقی ہے
مگر وہ اس روایت کو روا ہونے نہیں دیتا

❁❁❁

مناظر حسن شاہیںؔ

60, Millat Colony, Gaya - 823001 (Mob. 9661214111)

غزلیں

شب حیات کا چہرہ نکھار سکتا تھا
وہ اپنے دل میں ہی سورج اُتار سکتا تھا

میں جانتا تھا ، مرے بس میں اور کچھ بھی نہیں
مگر یہ جان کی بازی تو ہار سکتا تھا

میرے عدو تھے ، مگر دوستوں سے بہتر تھے
تمہی بتاؤ انہیں کیسے مار سکتا تھا

زمیں کا حسن بڑھانے کو اے ستارۂ جاں
تجھے میں بامِ فلک سے اُتار سکتا تھا

تمہارے حکم کی تعمیل تو ضروری تھی
وگر نہ جیتی ہوئی جنگ ہار سکتا تھا

یقیں کی ڈور ہی کمزور تھی بہت ، ورنہ
میں ڈوبتے ہوئے تجھ کو پکار سکتا تھا

رَچا گیا تھا سوئمبر جو حسن کا شاہیںؔ
سو جیتنے کے لئے عشق ہار سکتا تھا

❀❀❀

حریم شوق میں یہ پھول سے بہتر مہکتا ہے
سراپا اُس کا میرے خواب میں آکر مہکتا ہے

نسیم صبح بن کر میرے گلشن میں چلے آؤ
میں ایسا پھول ہوں جو بس تمہیں چھوکر مہکتا ہے

عزیزو! اینٹ گارے سے مکاں تعمیر کر لینا
محبت کے گلابوں سے مگر یہ گھر مہکتا ہے

بہت نایاب ہے کردارِ آدم ، سوچ کر دیکھو
زمیں کیا چیز ہے یہ چاند پہ جا کر مہکتا ہے

تمہیں کردار سے سسرال کا دل جیتنا ہوگا
یہاں سونا نہیں ، اخلاق کا زیور مہکتا ہے

ہمارے گاؤں کی تہذیب پلتی ہے وفاؤں میں
گلوں کی بات ہی کیا ہے یہاں پتھر مہکتا ہے

عروجِ فن کی خوشبو مست کر دیتی ہے شاہیںؔ کو
غزل پرواز جذبوں کا کبھی شہپر مہکتا ہے

❀❀❀

سائرؔہ عظیم
B-322, Gali No.5, Mandauli, Fazalpur, Delhi - 110092 (Mob. 8882181329)

غزلیں

جھونکوں کو ہواؤں کے گزرنا بھی یہیں ہے
خوشبو کی طرح ہم کو بکھرنا بھی یہیں ہے

اس ملک کی مٹی سے ہمیں پیار ہے بے حد
جینا بھی یہیں ہے ہمیں مرنا بھی یہیں ہے

پانی کی روانی کا ہے احساس ہمیں بھی
ہر حال میں دریا کو اترنا بھی یہیں ہے

میں دیر سے آئینہ کھڑی دیکھ رہی ہوں
سجنا بھی یہیں اور سنورنا بھی یہیں ہے

کرتے ہو ہر اک بات پہ لوگوں کی بھروسہ
وعدہ تو رہا وعدہ مکرنا بھی یہیں ہے

چھلکیں گے یہاں اشک بھی آنکھوں سے تمہاری
احساس ندامت سے گزرنا بھی یہیں ہے

حالات بدلنے میں کہاں دیر لگے گی
اب سائرؔہ قسمت کا سنورنا بھی یہیں ہے

❁❁❁

اس دفعہ سخت امتحان میں تھے
بند ہم بھی کسی مکان میں تھے

تیز آندھی چلی تھی بستی میں
وہ بھی اپنوں کے درمیان میں تھے

ہر طرف شہر میں تھے سناٹے
ہم بھی اس بار داستان میں تھے

پھر سے کی تھی سفر کی تیاری
پھر کسی ہم نئی اڑان میں تھے

تتلیاں اُڑگئیں یہاں ساری
چند جگنو ابھی دکان میں تھے

ہر طرف پھیلنے لگی خوشبو
وہ مگر اب بھی عطردان میں تھے

کوئی آرام بھی نہ کرپایا
سائرؔہ ہم عجب مکان میں تھے

❁❁❁

ڈاکٹر فرحت حسین خوشدلؔ

"Nasim Colony" Pagmal, Hazaribagh - 825301 (Mob.9113750958)

غزلیں

تیری قدرت کا ہر اک جا ہے نظارہ اللہ
میری تخلیق ترے فن کا ہے پارہ اللہ

زندگی جہد مسلسل ہے ، ہمیں ہے معلوم
موت لمحاتِ گزیدہ سے کنارہ اللہ

شب تاریک کی ہیبت سے لرزتا ہے وجود
دن ہے طوفان حوادث کا شمارہ اللہ

جب بھی کہتا ہوں غزل ، لگتا ہے ایسا مجھ کو
تونے اشعار کو قسطوں میں اُتارا اللہ

جن کو استاد کہا تھا وہ ہوئے برگشتہ
کاش سمجھیں وہ مرا شعری اشارہ اللہ

یہ دعا ہے لب خوشدلؔ پہ نہ جانے کب سے
دیکھے ناقد بھی مرے فن کا نظارہ اللہ

❁❁❁

غزل کی صنف کا ماہر ہے فنکاری دکھاتا ہے
وہ اپنے شعر میں لفظوں کی گلکاری دکھاتا ہے

تمام اشعار اس کے فن کی عظمت کے نمونے ہیں
وہ فن کا پاس رکھتا ہے تو فنکاری دکھاتا ہے

وفا سے دور کا بھی واسطہ اس کو نہیں لیکن
امیروں کو مگر اپنی وفاداری دکھاتا ہے

ہنرمندوں کی محفل راس کیسے آئے گی اس کو
جو فن سے نابلد ہیں ان کو فنکاری دکھاتا ہے

دیا قدرت نے جس کو شعر گوئی کا ہنر خوشدلؔ
وہ اپنے شعر میں فن کی گہر باری دکھاتا ہے

❁❁❁

مطالع زیبا

اضطرابِ خود نمائی کو حیا سمجھا تھا میں
وہ نگاہِ شوخ کیا کہتی تھی ، کیا سمجھا تھا میں (جمیلؔ مظہری)

بھلا چھپنے کا یہ عالم کہ عریانی نہیں جاتی
ہے آنکھوں آنکھ وہ صورت جو پہچانی نہیں جاتی (اجتبیٰ حسین رضوی)

دیکھتا ہوں دل کی دنیائے طرب جاتی ہوئی
یاد بھی اب اُن کی آتی ہے تو شرماتی ہوئی (پرویزؔ شاہدی)

سکوں نہیں نہ سہی ، دردِ انتظار تو ہے
ہزار شکر کوئی دل کا غم گسار تو ہے (معین احسن جذبیؔ)

پہلے پہل جب امبر کے نیچے ہم تم ملے تھے
خوشبو اُڑی تھی ، شمعیں جلی تھیں ، غنچے کھلے تھے (اویس احمد دوراںؔ)

یوں ہی مٹیں گے اور بنیں گے زندگی کے نقش پا
یہ سلسلہ دراز ہے ، نہ ابتدا نہ انتہا (سالکؔ لکھنوی)

ہر چند تجھ کو غیر سے نسبت ہے آج بھی
تیرا خیال دل کی امانت ہے آج بھی (نازؔ قادری)

ماسٹر محمد سعید نقشبندی
Sadiqpur, Israha, Darbhanga - 847121 (Bihar) (Mob. 9546276253)

غزلیں

وہ تو آئے نہ منھ چھپانے تک
راہ دیکھا یہاں سے جانے تک

دو گھڑی کے لیے سہی لیکن
کاش آتے غریب خانے تک

نہ سہی زیست میں خوشی نہ سہی
غم تو تھا ساتھ جانے جانے تک

گنج عرفاں کا دے رہا ہوں پتہ
میں تو پہنچا نہ اس خزانے تک

چلتی رہتی ہے موت کی آندھی
زندگی کا دِیا بجھانے تک

برق گرتی رہی تسلسل سے
آشیانہ مرا جلانے تک

خامشی کا زباں پہ پہرا تھا
تا نہ پہنچے کوئی فسانے تک

بالیقیں لوگ یاد رکھیں گے
قصہ دردماں زمانے تک

مسکراہٹ نہ آئی جیتے جی
رونا آیا ہے جانے جانے تک

اے مری موت آرہے ہیں وہ
ٹھہر کچھ دیر ان کے آنے تک

کتنی محدود زندگی تھی سعیدؔ
آنا جانا شراب خانے تک

❀❀❀

کون ہے وہ جو پس پردہ سحر کرتا ہے
لمحہ لمحہ جو میرے دل پہ اثر کرتا ہے

اس کے ہی عشق کا دل آج بھی دم بھرتا ہے
وہ ستم گر بھی نہیں ہے پہ ستم کرتا ہے

ہجر محبوب کا غم کیا ہے وہی جانے ہے
یاس و حرمان میں ہر پل جو بسر کرتا ہے

قابل رشک ہے جو شخص گزرگاہوں میں
صبر آفات میں ہرگام اگر کرتا ہے

یوں تو کہنے کو ہوں تنہا پہ میں تنہا بھی نہیں
کوئی تو ہے جو میرے ساتھ سفر کرتا ہے

آسماں والے میری بات کیا کرتے ہیں
دل مرا ہے کہ ہر اک پل کی خبر کرتا ہے

حسن خاموش ازل سے ہے نہاں پردے میں
عشق عالم میں مگر رقص شرر کرتا ہے

کامیابی وہی پاتا ہے زمانے میں سعیدؔ
آپ اپنے کو جو خود زیر و زبر کرتا ہے

❀❀❀

غزلیں

ڈاکٹر محمد زاہدؔ

B-5, Prince Dilawar Jah Lane, P.o.Garden Reach,
Kolkata 700024 (Mob. 8697194075)

لمحوں کے جگنوؤں کو گرفتار کیا کریں
بس میں نہیں ہے وقت ہی دلدار کیا کریں

تو بے وفا جو نکلا یہ تیری بات ہے
دامن کو ہم سمیٹ لیں اب تار کیا کریں

پاگل ہوا چلی ہے بجھا دے گی سب دیئے
دل کو جلانے کے سوا اے یار کیا کریں

یہ نفرتوں کے شعلے کر دیں گے راکھ سب
گھر کا بچانا اصل ہے مسمار کیا کریں

آئیں ذرا کھرچ کر دیکھیں تو آپ کو
بے کار کی یہ گرمیٔ گفتار کیا کریں

تنہائیوں کا حاصل زاہدؔ ہے کوئی فکر
صحرا میں جا رہیں گے بازار کیا کریں

❁❁❁

شکیلؔ ہاشمی

Sulemanganj, Sasaram - 821115
(Mob. 8409179513)

ہے سازشوں کے نشانے پر حال کا چہرہ
تڑپ رہا ہے یہاں اب کے سال کا چہرہ
بلندیوں پہ تم اِتراؤ پر خیال رہے
عروج ہی میں چھپا ہے زوال کا چہرہ
تمہاری بات تو پھولوں کی طرح ہے نازک
مگر نگاہ میں روشن ہے جال کا چہرہ
تمہارے لمس کی ان خوشبوؤں کی وادی میں
مہک اُٹھا مرے فکر و خیال کا چہرہ
ہر ایک سمت یہاں بام و دَر لرزتے ہیں
فضا کے رنگ میں ہے اشتعال کا چہرہ
مرے جواب کے بکھرے ہوئے اُجالوں میں
مچل کے رہ گیا اس کے سوال کا چہرہ
شکیلؔ ان کے ہی دم سے ہے روشنی ہر سو
وہ بے مثال سی آنکھیں کمال کا چہرہ

❁❁❁

نام کتاب	:	انسانیت اور محبت کا شاعر: ساحر لدھیانوی
مصنف	:	سریندر دیول
ترجمہ	:	استوتی اگروال
ناشر	:	قاضی محمد زکریا، میٹرلنک پبلشرز، لکھنؤ
اشاعت	:	۲۰۲۴ء صفحات : ۲۸۰
قیمت	:	۶۰۰ روپے
مبصر	:	خالد عبادی

ساحر لدھیانوی ایک بڑے شاعر ہیں یا نہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک ہر دل عزیز شاعر ضرور ہیں۔ ان کی شاعری نے بڑے پیمانے پر لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ ترقی پسند شاعروں میں فیض کے بعد ساحر کی مقبولیت کا گراف غالباً سب سے اوپر ہے۔ انہیں صرف نوجوانوں کا شاعر قرار دینا ایک طرح سے ان کی تضحیک کے مترادف ہے، حالاں کہ اس کے بہت سے مثبت پہلو بھی ہیں، جن پر آگے چل کر گفتگو ہوگی۔ سریندر دیول پر بھی ساحر کا جادو نوجوانی ہی میں چلا، لیکن وہ ساحر کے ایسے قاری ثابت ہوئے جن کی اثر پزیری کا دائرہ عمر کے ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا اور بالآخر انہوں نے ۲۰۱۹ء میں "SAHIRA Literaty Portrait" کے نام سے اپنے مطالعہ کا نچوڑ انگریزی میں پیش کر دیا، جس کی اشاعت آکسفورڈ یونیورسیٹی پریس سے ہوئی۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس کا دیباچہ گوپی چند نارنگ نے تحریر کیا ہے۔ اس دیباچہ کی آخری سطریں ساحر اور سریندر دیول دونوں کے تعلق سے قول فیصل کا درجہ رکھتی ہیں، لکھتے ہیں:

> ''ساحر لدھیانوی ایک اہم اردو شاعر ہیں۔ افسوس ان کی شاعری کا کوئی اچھا ترجمہ کہیں دستیاب نہیں، مجھے یقین واثق ہے کہ اس کتاب کو قارئین کا ایک وسیع حلقہ دستیاب ہوگا اور اچھے ادب کے سبھی قدردان ساحر کے فن وشخصیت کے بارے میں سریندر کی خامہ فرسائی کے گھائل بھی ہوں گے اور قائل بھی۔''

افسوس کہ یہ کتاب ترجمہ ہو کر نارنگ صاحب کی زندگی میں منظر عام پر نہیں آسکی۔ اس دیباچہ میں انہوں نے ساحر اور فیض کا موازنہ بھی کیا ہے۔ فیض احمد فیض کے پہلے شعری مجموعے ''نقش فریادی'' میں شامل مشہور زمانہ نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' اور ساحر کی پہلے شعری مجموعے ''تلخیاں'' کی کلیدی نظم ''تاج محل'' کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ دو شعری مجموعے جدید اردو شاعری کا خزینہ ہیں اور ان کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔''

اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

> ''ان دونوں شاعروں کے درمیان موجود لطیف فرق کو بیان کرنا آسان ہے نہ اس بارے میں سیدھے ڈھنگ سے بات ہو سکتی ہے۔''

کتاب کا باضابطہ آغاز ''تعارف'' سے ہوتا ہے، جس میں مختلف ذیلی عناوین (''ایک بھید، ایک پہیلی''، ''ایک ممتاز شاعر''، ''کتاب کے بارے میں'') کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے ساحر کی ابتدائی اور گھریلو زندگی، والدین کے درمیانی چپقلش، ازدواجی زندگی سے دوری اور والدہ کی رحلت کے بعد خود کو تنہائی کے خول میں قید کر لینے، جیسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد کتاب کو چار ابواب (۱) نظمیں: کڑوی اور میٹھی (۲) جنگ اور امن (۳) غزلیں اور گیت: ہر دھن

سریلی، گیت (۴) بھجن: اللہ تیرونام، ایشور تیرونام، میں منقسم کر کے ساحرؔ کے فکروفن اوراحتجاج ومزاحمت کی صدائے دلگیر کا ایماندارانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ کتاب کا اختتام ''حرف آخر'' (ایک نئی صبح کا دوت) پر ہوتا ہے۔ ''کتابیات'' کے لئے الگ سے دوصفحات مختص کیے گئے ہیں۔

''حرف آخر'' کے تحت ہمیں ایک ایسی بات کا علم حاصل ہوتا ہے، جس سے ساحرؔ کے بیشتر چاہنے والے بھی ناواقف ہیں۔ سریندر دیول کے یہ دواقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''یوں تو ساحرؔ کو گزرے ہوئے تقریباً چالیس برس کا طویل عرصہ بیت چکا ہے، لیکن وقت نے ان کی شخصیت ان کی شاعری اور ان کے 'محبت کے رشتوں' میں لوگوں کی دلچسپی کو ختم نہیں ہونے دیا۔''

''ان کے مجموعہ کلام 'تلخیاں' کے اردو اور دیوناگری میں درجنوں ایڈیشین اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ اگرچہ ان میں طبع زاد اور سارق دونوں نسخے شامل ہیں، لیکن اس نے 'دیوانِ غالبؔ' کے بعد اردو شاعری کی سب سے زیادہ فروخت ہونیوالی کتاب کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ ان کے شعری مجموعے اب تک ان کے ہم عصروں مثلاً مجروحؔ، مجازؔ، کیفیؔ، اخترؔ اور جعفریؔ سے زیادہ فروخت ہو چکے ہیں۔''

اس سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ساحرؔ کی شخصیت اور ان کی زندگی میں ایک ایسا جادو ضرور موجود تھا، جس کی زد سے ان کے پڑھنے والے کبھی باہر نہیں نکل سکے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ اس کے باوجود اگر انہیں ''ٹین ایجرس'' کا شاعر کہا جاتا ہے تو یہ کوئی خفیف اور شرمسار کرنے والی بات نہیں۔ علی سردار جعفری جیسے شاعر اور دانشور اس سلسلے میں صاف صاف تحریر فرماتے ہیں کہ:

''کچھ لوگوں نے ساحرؔ کی شاعری کو یہ کہہ کر مسترد کرنے کی کوشش کی کہ وہ صرف نوجوانوں کے لئے لکھنے والے ایک رومانوی شاعر ہیں، لیکن یہ بدنامی بھی ساحرؔ کو باقاعدہ استحکام بخشتی ہے۔ آپ یہ سوال خود ہی سے پوچھ کر دیکھئے کہ آج کتنے شاعر ہیں جن کی شاعری نوجوانوں کو پسند آتی ہے؟ نوجوانوں کے جذبات بالکل تروتازہ ہوتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے اور سنتے ہیں اس میں ایک پاکیزگی ہوتی ہے۔ ان کے دل میں کچھ نیا اور انوکھا حاصل کرنے کا خواب ہوتا ہے اور وہ ان خوابوں کو پورا کرنے کا عزم اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ ان احساسات کو اپنی شاعری میں ساحرؔ نے جس توانائی سے قلم بند کیا ہے ویسی توانائی اس دور کے دوسرے شاعر میں نظر نہیں آتی۔''

''انسانیت اور محبت کا شاعر: ساحرؔ لدھیانوی'' جس کا انگریزی سے ترجمہ استوتی اگروال نے کیا ہے۔ وہ ایک بہترین ادیبہ، مدیرہ اور ساحرؔ سے محبت کرنے والی ایک سچی شاعرہ ہیں۔ یہ بڑے افتخار کی بات ہے کہ انہوں نے اپنے قلم کا بہترین استعمال کر کے وہ کر دکھایا جو دوسرے نوجوانوں کو ہمیشہ مہمیز کرتا رہے گا۔

ساحرؔ کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں کہ ان کے ذکر کے بغیر ان کی حقیقی پہچان ممکن نہیں۔ ایسی نظموں میں ''تاج محل''، ''فنکار''، ''خون پھر خون ہے''، ''آواز آدم''، ''عورت نے جنم دیا مردوں کو''، ''نور جہاں کے مزار پر''، ''کیسی گزری''، ''میرے وطن''، ''جواہر لعل نہرو'' وغیرہ نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔

ایک تبصرے میں صرف نظموں کے نام گنوائے جا سکتے ہیں، انہیں پیش کرنا ممکن نہیں، البتہ غزلوں کے اشعار ضرور پیش کئے جا سکتے ہیں، جن سے ساحرؔ کی حقیقی شبیہ ابھر کر سامنے آجاتی ہے جو ساحرؔ کے احساسات کی بھی نمائندگی کرتے ہیں اور اس سے ہمارے جذبات کی ترجمانی بھی ہو جاتی ہے۔

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتہ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارہ نہیں ہوتی

میں اور تم سے ترک محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غم روزگار نے

مانا کہ زندگی کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

اے روح عصر جاگ کہاں سو رہی ہے تو
آواز دے رہے ہیں پیمبر صلیب سے

ساحؔر نے نظموں، غزلوں اور گیتوں کے علاوہ فلموں کے لئے کچھ انتہائی خوبصورت اور متاثر کن بھجن بھی لکھے ہیں، ایسا اس لیے ممکن ہو سکا کہ بقول دیویندر دیول:

''ساحر ایک سیکولر انسان تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ہر قسم کی مذہبی جارحیت اور فرقہ واریت کی مخالفت کی، اگرچہ وہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، لیکن انہوں نے اپنے آپ کو ان تنگ نظر سے دور رکھا جو لوگوں کے درمیان باہمی انتشار کو ہوا دیتے تھے۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ بھی لکھتے ہیں کہ:

''ساحر لدھیانوی نے ہندی سنیما کے لیے چند بہترین بھجن لکھے ہیں۔''

''مجموعی طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ساحؔر نے جس صنف سخن کو بھی ہاتھ لگایا ہے اسے کمال تک پہنچا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مقبولت اور ہر دل عزیزی میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

نام کتاب	:	افکارِ نو بہ نو (شعری مجموعہ)
مصنف	:	سید نفیسؔ دسنوی
ناشر	:	روشان پرنٹرس، دہلی
صفحات	:	۱۴۴ قیمت : ۲۰۰ روپے
مبصر	:	**ڈاکٹر رفیق احمد**

ماضی قریب میں سرزمین دسنہ کو علمی وادبی دنیا سے متعارف کرانے والوں کی ایک طویل فہرست ہے جس میں سید سلیمان ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، عبدالقوی دسنوی وغیرہ کے اسمائے گرامی انتہائی اہمیت وافادیت کے حامل ہیں، عصر حاضر میں پروفیسر سید منظر حسن دسنوی کے علمی خانوادے نے بھی اس شہر کی شہرت ومقبولیت میں اپنی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کے ذریعے اضافہ کیا ہے۔ اس علمی خانوادے سے جو چراغ روشن ہوئے ہیں اس کی ضیا پاش قندیلیں آج بھی علم وادب کی حسین شاہراہ کو منور کئے ہوئے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کے مصنف سید نفیسؔ دسنوی کی علمی وادبی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے پروفیسر کرامت علی کرامتؔ کے الفاظ میں:

''اڑیسہ میں اردو شعروادب کو فروغ دینے کے سلسلے میں دسنوی خانوادے کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ سید نفیسؔ دسنوی کے والد ماجد پروفیسر سید منظر حسن دسنوی بہار کے 'ہفت اختر' میں شمار کئے جاتے تھے۔ نفیسؔ کے بڑے بھائی سید شکیلؔ دسنوی اردو کے جانے پہچانے شاعر اور ادیب تھے اور نفیسؔ دسنوی متعدد شعری مجموعوں کے مصنف ہیں۔''

''افکارِ نو بہ نو'' کے مصنف کو شعروشاعری وراثت میں ملی ہے۔ ان کے والد پروفیسر سید منظر حسن دسنوی اردو کے نامور ادیب وشاعر تھے ان کا شعری مجموعہ ''یادوں کی دہلیز'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا تھا۔ نفیسؔ دسنوی کے بھائی سید شکیلؔ دسنوی کے چار شعری مجموعے ''زندگی اے زندگی''، ''تنہا تنہا''، ''کتنی حقیقت، کتنا خواب'' اور ''دل ناآشنا'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب کا نام شکیلؔ دسنوی کے اس شعر سے ماخوذ ہے ۔

آتے ہیں جیسے غیب سے افکارِ نو بہ نو
مجھ کو تو شعر گوئی بھی ، پیغمبری لگے

اس علمی خانوادے کی تیسری نسل میں سید آصف دسنوی کا مجموعہ کلام ''کہی اَن کہی'' کے نام سے منظر عام پر آ چکا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سید نفیسؔ دسنوی کی شاعری کسبی کے ساتھ ہی وہبی اور وراثتی بھی ہے، نفیسؔ دسنوی کو شعروشاعری اور سائنسی علوم سے دلچسپی کے ساتھ اردو شعروادب سے خصوصی لگاؤ تھا، شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شاعری کو وسیلہ اظہار بنایا اور اس میدان میں موصوف کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں، کٹک کے نامور ادیب وشاعر عبدالحق بیتابؔ کا خیال ہے کہ:

''نفیس دسنوی کی شعری خصوصیات میں سے ایک یہ بھی
ہے کہ ان کے اشعار کبھی ترسیل کی ناکامی کا شکار نہیں
ہوئے، وجہ آسان لفظوں کا انتخاب، سلاست بیان،
بحروں کی غنائیت اور بڑی حد تک اپنے اشعار کو ابہام
سے پاک رکھنا بھی ہے۔''

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف نفیس دسنوی کی اب تک پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں چار شعری مجموعے اور ایک مجموعہ مضامین ''آئینہ ادراک'' مطبوعہ ۲۰۲۴ء شامل ہے۔ ''حرف جاوداں'' غزلوں پر مشتمل موصوف کا اولین شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آیا تھا، جب کہ ''نورِ حرا'' حمدیہ و نعتیہ شاعری کا مجموعہ ہے جو ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا، تیسرا شعری مجموعہ جس میں غزلیات و قطعات شامل ہیں، ''لفظ لفظ آئینہ'' کے نام سے ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد غزلوں پر مشتمل زیر نظر شعری مجموعہ ''افکارِ نو بہ نو'' کے نام سے ۲۰۲۲ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ نفیس دسنوی کی ولادت کٹک میں ہوئی آپ کا آبائی وطن دسنہ بہار ہے، شاعری کا آغاز ۱۹۷۰ء میں ہوا، تخلیقی سفر تقریباً پانچ دہائیوں سے جاری ہے۔

نفیس دسنوی کے زیر نظر شعری مجموعہ ''افکار نو بہ نو'' میں دو حمد، تین نعت اور ۹۸ غزلیں شامل ہیں۔ اس کے ابتدائی ۲۵ صفحات پر فہرست غزلیات اور پیش لفظ کے علاوہ مصنف کے بارے میں سعید رحمانی، ضیاء فاروقی اور ایم نصر اللہ نصر کے تعارفی کلمات شامل اشاعت ہیں جب کہ صفحہ ۲۶ سے ۱۲۸ تک نفیس دسنوی کی شعری تخلیقات شامل ہیں، اسی طرح ص ۱۲۹ سے ص ۱۴۴ تک مصنف کی شاعری سے متعلق مشاہیر ادب وغیرہ کے گراں قدر تاثرات شامل کتاب ہیں۔

زیر نظر شعری مجموعہ ''افکارِ نو بہ نو'' کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں شامل تمام غزلیں اور تخلیقات صرف چھ اشعار پر مشتمل ہیں۔ اس طرح حمد و نعت اور غزلوں کے اشعار کی مجموعی تعداد ۶۱۸ ہے۔ نفیس دسنوی کے تخلیقی اور شعری رویوں میں جدت پسندی اور عصری حسیت کے ساتھ زندگی کے مختلف مسائل کا بیان بڑی باریک بینی سے ہوا ہے۔ شعری اور فنی لوازمات کو برتنے میں انہیں قدرت کاملہ ہے اور اس میں یقیناً دورائے نہیں کہ وہ مختلف لب و لہجے اور منفرد اسلوب کے

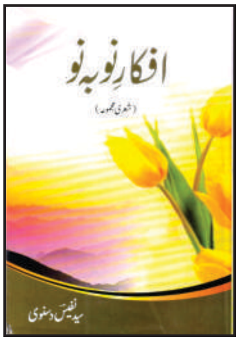

جدت پسند شاعر ہیں۔ نفیس دسنوی فکری بصیرت کے حامل ایسے ممتاز اور قادر الکلام شاعر ہیں جن کے جداگانہ لب و لہجے کی شناخت اردو کا حساس قاری دور ہی سے کر لیتا ہے۔ آپ کا تخلیقی شعور کافی سلجھا ہوا اور موجودہ شعری منظرنامے سے قدرے مختلف ہے، ان کی شاعری میں عصری حسیت کی جھلک نظر آتی ہے ان کے کلام کی امتیازی خصوصیت میرے خیال میں غم دوراں کی ترجمانی ہے۔

حقیقت میں ان کی شاعری ہمارے عہد کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ اپنی غزلوں میں انہوں نے زمانے کی ستم ظریفی کو موضوع سخن بنایا ہے، نفیس دسنوی کی شاعری میں سماجی شعور اور جدید عصری مسائل کا بیان بڑے اچھے ڈھنگ سے ہوا ہے۔ ان کی شاعری زمان و مکان کی حد بندیوں سے آزاد ہے اور ماضی کی حسین قدروں کا بیان۔ اس میں موجودہ عہد کی درد و کرب بھری زندگی کی داستان اور مستقبل کے لائحہ عمل کا اشاریہ بحسن وخوبی ہوا ہے۔ عصری آگہی کا کرب اور زمانے کی ستم ظریفی کا تذکرہ ان کی شاعری کی امتیازی خوبیوں میں سے ہے۔ ان کے یہاں زندگی کے فلسفے کو بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے، عصری مسائل کو بیان کرنے میں انہیں افکارانہ مہارت حاصل ہے، افکار میں ندرت اور خیالات میں جدت ان کی شاعری کی نمایاں اور منفرد خوبیوں میں سے ہے۔ فکری نفاست و پاکیزگی ان کی غزلیہ شاعری کی شانِ معراج ہے۔ مجموعی طور پر حمدیہ و نعتیہ شاعری میں احساسات کی پاکیزگی اور غزل گوئی میں جدت طرازی نفیس دسنوی کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ثانی کہاں جہاں میں اس کا کوئی نفیس
واحد ہے اس کی ذات وہی بے مثال ہے

یہ نعت سرور جو لکھ رہا ہوں اسی کا سارا اثر ہے اس میں
سخن کی محفل میں معتبر اب نفیس اپنی بھی شاعری ہے

یہ دنیا مہر و الفت کا حسیں شہکار ہو جائے
جو عثمان و عمر جیسا ترا کردار ہو جائے

خوشی کے شادیانے ہیں امیروں کی وراثت میں
مگر مفلس کے گھر کی بیٹیاں کچھ اور کہتی ہیں

چشم زدن میں طے ہوا صدیوں کا فاصلہ
وہ معجزہ تھا ، اس کو سفر مت کہا کرو

نہ اتراؤ جہاں والو ، ذرا سی کامرانی پر
کہ میں نے خاک میں ملتے ہوئے شہرت کو دیکھا ہے

نفیسؔ اس شاعری سے فائدہ ہوتا نہیں کچھ بھی
یہی اک بھول ہے جس کو دوبارہ کر لیا میں نے

مر جانے کے بعد زمانہ کرتا ہے تعریف بہت
عزت کب دیتی ہے دنیا جیتے جی فنکاروں کو

کرن سورج کی آئے گی بھلا کیسے مرے گھر تک
امیر شہر کی چاروں طرف اونچی عمارت ہے

کفن پر داغ مٹی کے ابھی لگ بھی نہ پائے تھے
ہوئے ورثا کے ہاتھوں باپ کی جاگیر کے ٹکڑے

❁❁❁

تصادم (ص ۵۴ سے آگے)

''پرمود، میرا دل کہتا ہے کہ تم نے اس کے بارے میں جو کچھ سنا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ میرے صحیح ماننے یا نہ ماننے کا کوئی جواز نہیں ہے، لیکن تم نے کئی بار اس کو مجھ سے ملوایا ہے۔ مجھے ہر بار اس کے چہرے پر پاکیزگی کی چمک دکھائی دی ہے۔''

پرمود کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ اپنی شہوت پرستی کی وجہ سے وہ ہر لڑکی کے ساتھ عارضی تعلق بناتا آ رہا تھا۔ کسی تعلق کو استحکام دینے کے بارے اس نے سوچا ہی نہیں تھا کبھی۔ روبی کو بھی وہ جتنی بار ملا تھا اس کے اندر کی ہوس بیدار ہوئی تھی، لیکن کیوں اس نے ہمیشہ روبی کو اَن چھوا رکھا تھا؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ چاہتا تو وہ روبی کے ساتھ بھی وہی کچھ کرسکتا تھا جو وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ کرتا تھا، لیکن کوئی غیبی طاقت تھی جو ہر بار اسے ایسا کرنے سے روک دیتی تھی۔

''کہاں کھو گئے حضرت؟'' پرمود کو گہری خاموشی میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر راکیش نے پوچھا۔

پرمود نے جیسے خواب سے بیدار ہوتے ہوئے کہا ''تصادم جاری ہے میرے اندر جسم اور روح کے درمیان، جنسیت اور روحانیت کے درمیان، مساوات اور مطلق العنانیت کے درمیان۔ وقت دے رہا ہوں طرفین کو، جس کی فتح ہوگی، اسی کے حق میں فیصلہ کروں گا۔'' ❁❁

مدعا (ص ۵۵ سے آگے)

کتنی محنت کے بعد اس فلم میں رول ملا تھا۔ آخر کیا وجہ ہے فلم چھوڑنے کی صرف معمولی سی تکرار......اور اتنا بڑا فیصلہ......سچ میں پاگل ہو تم......!''

شردھا غصہ سے بولی: ''تمہارا لیکچر ختم ہو گیا ہو تو سنو، ڈائریکٹر مجھ سے دومنٹ کا ایک سین کروانا چاہتا تھا، جس میں مجھے ٹو پیس میں سوئمنگ پول سے نکلتے ہوئے فلم کے ہیرو کے ساتھ لپ لاک کرنا تھا، میں نے ڈائریکٹر سے بہت کہا، بہت سمجھایا، مگر وہ سالا ٹس سے مس نہیں ہوا، بولا کہانی کی مانگ کے مطابق ہی رکھا ہے۔''

روپا اس کی بات کاٹتے ہوئے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی: ''صرف دومنٹ کے کسنگ سین کے لئے اتنا بوال......؟ ارے آج کل تو فلموں میں یہ سب چلتا ہے، بلکہ ضروری حصہ بن گیا ہے یہ سین تو فلموں میں......اتنی ہی ستی ساوتری تھی تو فلم انڈسٹری میں آئی ہی کیوں......کسی مندر میں بیٹھ جاتی......پاگل......''

''پاگل میں نہیں تم ہو......چلو تم ہی بتاؤ...... پوری فلم میں دومنٹ کے ایک سین میں......میں اپنی ایکٹنگ اور جسم کا کھل کر مظاہرہ کیسے کر پاؤں گی......'' اور پھر وہ پیر پٹختے ہوئے اٹھی اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ ❁❁

☆ ’’زبان وادب‘‘ اپریل ۲۰۲۵ء موصول ہوا۔ شکیلؔ بدایونی پر یادگاری ڈاک ٹکٹ اور ان کی کتابوں کے عکس سے پرچہ کا سرورق چمک رہا ہے تو پروفیسر معین الدین دردائی کی تصویر اور ان کی تصنیفات کے عکس سے پس ورق کی زینت بھی دوبالا ہو رہی ہے۔ یہ گویا کیمرے کی زبانی شخصیتوں کے کارناموں کی کہانی ہے جو آپ کی صحافتی محنت اور دانشوری کے صدقے ہمیں سننے کو مل جاتی ہے اور بحیثیت ناظر ہمارے ذوق جمال کو بھی تازہ تسکین دے جاتی ہے۔ اندرونی سرورق پر مبارکؔ عظیم آبادی کی تصویر دیکھنے کو اور ان کی سوانح کے ساتھ ان کی خوبصورت غزل پڑھنے کو ملی تو اندرونی پس ورق پر ل۔ احمد اکبر آبادی کی تصویر، ان کے مختصر سوانحی کوائف اور اُن کے اقوال سے حظ وافر نصیب ہوا۔ یہ بہت ہی اچھی بات ہے کہ ’’زبان وادب‘‘ کے سر اوراق اور پس اوراق کا اہتمام اس طرح معلومات میں اضافہ کا ذریعہ بن رہا ہے، پھر میرے خیال سے یہ روش بھی لائق تحسین ہے کہ شکیلؔ بدایونی جیسے شاعر کو جس کا ذکر فلمی شاعر کہہ کر ختم کر دیا جاتا ہے، آپ نے ایک خالص ادبی فنکار کے روپ میں جگہ دیا ہے، اس کے لئے محترمہ زیبا پروین یقیناً شکریہ کی مستحق ہیں کہ انہوں نے کہنے کو شکیلؔ بدایونی کی شاعری پر چند نکات تحریر میں لایا ہے، مگر یہ نکات کئی اہم، معلوماتی پہلو کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر شکیلؔ کے نظریہ شاعری کا بیان اور ان کا نعتیہ کلام تو ان کی شخصیت کا الگ ہی جلوہ دکھا جاتا ہے، ایسا جلوہ جسے عام معنوں میں فلمی شاعر سے منسوب کرنے کا تصور بھی بمشکل ممکن ہے۔ اس شمارے میں یوں تو سبھی مضامین عمدہ اور معیاری ہیں، البتہ تازہ کاری کے لحاظ سے جیسا کہ آپ نے بھی لکھا ہے ’’۲۰۲۴ء کے خوبصورت افسانوی مجموعے‘‘ پر پروفیسر اسلم جمشید پوری کی تحریر سبھوں پر سبقت رکھتی ہے اور شاید کہ حاصل شمارہ کہلانے کی حقدار بھی ہے۔ ظہیرؔ دہلوی پر ڈاکٹر سید صابر حسن کا مقالہ قدرے روایتی انداز سے ترتیب پایا ہے اور ظاہر ہے کہ صنف افسانہ پر ڈاکٹر مسرت کا مضمون بھی تکرار بیان کا احساس دلا رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ طلبا و طالبات کے لئے آموزشی تربیتی طریق کار کے لحاظ سے یہ ’’روایتی انداز‘‘ اور ’’یہ تکرار‘‘ مناسب اور مفید کہلانے کا حق ضرور رکھتی ہے اور اس جہت سے یہ دونوں مقالہ بہرحال کامیاب ہے۔ میرے خیال میں شوکت حیات پر جناب سلطان آزاد کے مقالے کا خاص حصہ وہی ہے جہاں انہوں نے قاری کو اپنی یادوں میں شریک کرلیا ہے اور اس طرح شوکت حیات کی شخصیت کے کچھ خاص گوشے منور ہو گئے ہیں۔ منٹو کے ’’پھندنے‘‘ کے تجزیاتی مطالعہ میں ڈاکٹر فتح عالم یقیناً کامیاب کہلائیں گے اور جناب طلحہ نعمت ندوی کے مضمون ’’پروفیسر سید حسن عسکری کی اردو تحریریں‘‘ کا تحقیقی پہلو بھی روشن ہے اور اس میں کیا شبہ کہ ’’معین الدین دردائی: حیات و نگارشات‘‘ میں ڈاکٹر محمد ثاقب انور نے مواد کی کمی کے باوجود اپنی تلاش، اپنی محنت اور اپنی تجزیاتی نگاہ کے ساتھ موضوع سے بیش از بیش انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مضمون کا وہ حصہ خصوصیت سے متوجہ کر گیا جس میں انہوں نے کماحقہٗ توجہ سے دردائی کی محرومی کے بعض نفسیاتی اور جبریہ عصری اسباب کی طرف اشارے کئے ہیں اور پھر اس مضمون کی وہ سطریں بھی نہایت قیمتی ہیں اور کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں جو دردائی کی تحریروں کے اقتباسات سے ہماری ضیافت کر رہی ہیں۔ اس مضمون کے آخر میں باپو کے خط کا جو عکس فیلر کے طور پر دیا گیا ہے، وہ واقعی دستاویزی ہے اور یوں رسالہ کی اشاعت کے مہینہ یعنی اپریل سے مطابقت بھی رکھتا ہے کہ اس میں علامہ اقبالؔ کا ذکر ہے اور اقبالؔ کی وفات اسی

مہینہ میں ہوئی تھی۔ افسانہ نگار کسی لفظ کو خاص تخلیقی مفہوم دے کر کس طرح اس سے کہانی کے کلائمکس کا کام لیتا ہے اور کہانی کی سرخی سے مطابقت لادیتا ہے، اس کی خوبصورت مثال جناب عظیم اقبال کی کہانی ''کاش'' میں پڑھنے کو ملی۔ محترم عظیم اقبال ایک پرانے اور منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے اس رومانی کہانی کو جس طرح اخلاقی احساسِ دروں تک پہنچایا ہے، شاید کہ یہ انہیں کا حصہ ہے، پھر ڈاکٹر شاہد فروغی کے افسانہ ''سڑا ہوا ہاتھ'' نے بھی بے حد متاثر کیا۔ اس کہانی پر ''حرف آغاز'' میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے صدفی صد مجھے اتفاق ہے۔ خصوصاً اس کا کلائمکس جس طرح بیوی کی محبت کو دکھاتا ہے وہ تادیر نافراموشیدنی ہے۔ جناب نثار احمد صدیقی کا ڈرامہ ''بیٹا'' بھی بے حد متاثر کر گیا، یہاں واقعی کشمکش، تصادم اور تذبذب وتجسس جیسے فنی عناصر بخوبی کام میں لائے گئے ہیں۔ رسالہ کا شعری حصہ بھی بہت اچھا ہے۔ خاص طور سے مرغوب آثر فاطمی، نذر فاطمی، اویناش امنؔ اور رہبرؔ گیاوی کے غزلیہ کلام بے حد پسند آئے، ڈاکٹر آصف سلیم کے قلم نے اگر جناب اخترؔ واصف کے افسانوی مجموعہ ''سمندر پر ایک اُڑان'' کے تبصرہ کا حق ادا کیا ہے اور نہایت کامیابی سے بعض افسانوں کے استعاراتی اور علاماتی عقدے کھول دئے ہیں جوان افسانوں کی تجزیاتی تفہیم تک رسائی میں آسانی کا موجب بنے ہیں تو ڈاکٹر ممتاز فرخ نے بھی ڈاکٹر اسلام عشرت کی کتاب ''شاہد جمیل: رنگ وآہنگ'' پر متوازن تبصراتی اظہار خیال میں کسی بخل یا کسل یا پھر کسی طرح کے غلو سے کام نہیں لیا ہے۔ بلاشبہ یہ تبصرے زیر مطالعہ کتابوں کے قابل ذکر پہلو آئینہ کردینے میں کامیاب ہیں۔ ''سلام و پیام'' کے تحت آپ نے جناب اختر کاظمی کے طویل خط کو جگہ دیا ہے جو بظاہر طویل سہی، مگر ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ گویا ایک عینی شاہد کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے جو اپنے موضوع کے تعلق سے بہت سے اَن کہے پہلو بھی اُجاگر کررہا ہے۔ 'بچوں کا زبان وادب' میں ڈاکٹر بانو سرتاج کی کہانی ''مچھروں کی ہڈیاں'' اور محترمہ صبا پروین کی کہانی ''تقدیر کا کھیل'' اخلاقی اور زیرکی پہلو سے بہت کامیاب ہے اور جنابہ عرشی فاطمہ (علیگ) کا سائنسی مضمون ''ہماری کائنات'' اور جناب غلام محمد کا معلوماتی مضمون ''بابائے ہومیو پیتھ'' بھی بہت کارآمد ہے۔ مضامین اور کہانیوں میں اسی طرح موضوعی تنوع برابر رکھا جائے تو میرا خیال ہے کہ اس سے بچوں کی دلچسپی مزید بڑھے گی اور انہیں زیادہ سے زیادہ علمی فائدہ بھی ملے گا۔ خدا کرے رسالہ کا اشاعتی سفر اسی طرح اپنی منزلیں کامیابی سے طے کرتا رہے۔ آمین!

(ڈاکٹر) ایم ضیاء الدین احمد، پٹنہ سیٹی

☆ ماہ اپریل ۲۰۲۵ء کا ''زبان وادب'' ملا۔ اس میں شک نہیں کہ رسالہ میں بچوں کا حصہ آپ بہت ہی توجہ سے اور بہت ہی اچھی اچھی دلچسپ اور معلوماتی تحریروں کے ساتھ شامل کرتے ہیں۔ اس شمارے میں بھی ''بچوں کا زبان وادب'' بہت خوب ہے۔ ڈاکٹر بانو سرتاج، بڑوں کے ساتھ ساتھ ہم بچوں کے لئے بھی بہت عمدہ عمدہ کہانیاں لکھتی رہتی ہیں اور ''زبان وادب'' کے ہم نونہال قاری بہرحال ان کی سوغات ملنے اور اسے سمیٹنے کے انتظار میں رہتے ہیں۔ اس بار ان کی مزے دار کہانی ''مچھروں کی ہڈیاں'' آپ نے چھاپا ہے۔ سچ مچ یہ کہانی بہت ہی پیاری کہانی ہے۔ یہاں ٹھگوں کی ایک دنیا ہے، مگر اصل مقصد صرف ان کی ٹھگی اور چالبازی کو دکھانا نہیں ہے، بلکہ اصل مقصد وہی بات بتانا ہے جو سرائے کی مالکن نے ٹھگی کا شکار ہونے والے تاجر سے کہا ہے کہ ''سفر پر جاتے وقت کسی بھی اَن جان شخص پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے، دیکھ پرکھ کر دوست بنانا چاہئے، سوچ سمجھ کر سودا کرنا چاہئے۔'' پرانے زمانے میں لمبے لمبے سمندری تجارتی سفر کرنے والوں کے لئے یہ نصیحت جتنی اہم تھی، شاید آج کے نئے زمانے میں اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ سفر میں ذراسی غفلت، نیند اور لاپرواہی سے، یاباتونی قسم کے ٹھگ لوگوں کی چالبازی میں پھنس جانے سے جان اور مال دونوں کے لالے پڑجاتے ہیں۔ سفر تجارتی ہو یا تفریحی، خاص طور سے

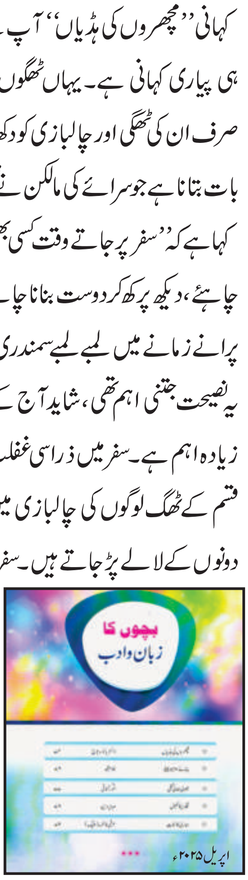

بس، ٹرین یا لوکل سواری کا سفر، آئے دن مسافروں کے نقصان کی خبریں پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ یہ کہانی سفر اور تجارت دونوں میں ہوشیار اور محتاط رہنے کا سبق

دے رہی ہے۔اس میں دوسرا سبق یہ بھی ہے کہ جہاں تک ہو سکے، مصیبت میں پھنس جانے والے مسافروں کی عقلمندی کے ساتھ مدد ہونی چاہئے۔مشکل میں گھبرانے سے نہیں بلکہ فوراً مناسب تدبیر کرنے اور بڑوں کے مشورے پر چلنے سے ہی بات بنتی ہے۔یہاں مکھیا کا انصاف بھرا رویہ اور سرائے مالکن کی عقلمندی ہی کام آئی اور اس طرح ٹھگوں کا گروہ اپنے مقصد میں نا کام ہوا۔اس کہانی کے آخر میں ''حسد:نیکیوں کا دشمن'' کے عنوان سے مختصر سافیچر بھی بہت کارآمد ہے۔اس میں غصہ کرنے والوں اور ان کی متواتر حرکتوں کی جو مثال لکھی ہے یا اس طرح کہیں کہ جو منظر کھینچا گیا ہے، وہ تو بہت ہی غضب کا ہے اور بہت ہی پراثر بھی۔یہ لکھتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ اس شمارے میں کہانی کے ساتھ ساتھ مضامین بھی کافی معلوماتی ہیں۔''بابائے ہومیو پیتھ'' کے عنوان سے جناب غلام محمد کا مضمون کافی فائدہ منداور معلوماتی لگا،اس لئے کہ اس میں صرف ڈاکٹر ہانیمن کے حالات زندگی نہیں ہیں بلکہ مضمون نگار نے ان کے اصولِ علاج سے بھی بہت آسان انداز میں ہمیں واقف کرادیا ہے اور علاج بالمثال کا مطلب سادہ لفظوں میں سمجھا دیا ہے۔اس مضمون کے آخر میں پیاز کے عرق سے زکام کے مریض کو فائدے والی بات پڑھ کر، گھر میں بڑے بوڑھوں کی زبانی سنی ہوئی ایک بات یاد آئی تو ہنسی آگئی۔ وہ لوگ بتاتے تھے کہ جب سخت زکام ہوتا تھا تو تیز مرچ ڈالا ہوا سالن کھانے کا مشورہ دیا جاتا تھا، گویا یہ علاج بالمثل جیسی ہی ایک ترکیب تھی۔ بہرحال اس میں کیا شک کہ ہانیمن جیسے، عالم انسانیت کے محسن صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔اس مضمون کے آخر میں جناب انور آفاقی کی نظم ''بھولی بھالی تتلی'' آپ نے شائع کیا ہے جو اس حصہ کی اگرچہ تنہا نظم ہے،مگر بہت پیاری اور خوبصورت،اس معنی میں بھی کہ شاعر نے اس میں تتلی کی زندگی کا سبق بھی بتا دیا ہے اور وہ سبق یہ ہے کہ دن بھر محنت اور رات کو آرام کی نیند۔ بیشک اللہ نے دن کام کے لئے بنائے ہیں اور رات سونے کے لئے ہے۔محترمہ صبا پروین کی کہانی ''تقدیر کا کھیل'' بھی بہت دلچسپ ہے۔خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں ''پھر آگے کیا ہوا؟'' کا سوال آخر آخر تک کھلتا نہیں ہے۔بیشک تدبیر ضروری ہے،مگر تقدیر تو اللہ کے فیصلے کا نام ہے اور اس پر یقین ہر حال میں ہونا چاہئے۔ سچ مچ جو کام اشرفیاں نہ کر سکیں اگر وہ لوہے کے ایک بیکار سے ٹکڑے سے ہو جائے اور وہ بھی کسی کوشش کے بغیر تو اسے تقدیر کا نرالا کھیل ہی کہا جائے گا۔ یہ کہانی پڑھ کر یہ بھی احساس تازہ ہوا کہ انسان کو کبھی مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہئے اور ہمیشہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے پر خوش دلی سے آمادہ ہونا چاہئے۔اس بار ''بچوں کا زبان وادب'' جس تحریر پر ختم ہو رہا ہے وہ محترمہ عرشی فاطمہ کا سائنسی مضمون ''ہماری کائنات'' ہے جو بہت ساری نئی نئی معلومات سے آراستہ ہے اور خاص بات یہ بھی کہ اس میں اصطلاحی الفاظ یعنی Termlogy کو انگریزی میں بھی لکھ دیا گیا ہے جس سے سمجھنے میں آسانی ہو رہی ہے۔کیا اچھا ہو کہ جغرافیائی اور میڈیکل سائنس پر ایسے مضمون برابر پڑھنے کو ملتے رہیں۔

حنا نسیم، علی گڑھ

☆ مارچ ۲۰۲۵ء کا اکادمی مجلّہ ''زبان وادب'' نہایت خوبصورت گیٹ اپ اور معیاری مشمولات کے ساتھ بدست ہوا۔مقالات کافی مفید اور معلوماتی ہیں۔افسانے،منظومات اور ''کتابوں کی دنیا'' سبھی کچھ اپنی اپنی جگہ بہت خوب ہے،خصوصاً اس شمارے میں ڈاکٹر اسلم جاویداں کا تحقیقی اور وقیع مقالہ ''امالہ سے بے نیازی'' ایک بڑی غلطی'' بے حد پسند آیا۔اسلم جاویداں کا یہ مقالہ اہل زبان کے ساتھ ساتھ بالخصوص طلبا اور Teacher's Community کے لئے بھی انتہائی ثمر آور اور ثمر بخش ہے۔میں اس کے لئے قلم کار کا بھی اور آپ کا بھی بہت مشکور ہوں کہ آپ نے ایسے اہم مقالے کا انتخاب کرکے ہم قارئین کے درمیان ایک علمی تحفہ پیش کیا ہے۔''بچوں کا زبان وادب'' بھی دل خوش کردینے والے تحفہ سے یقیناً کم نہیں ہے۔صفحہ نمبر ۷۷ پر

راقم الحروف کے مضمون بعنوان ''ایک بھارت شریشتھ بھارت '' کی اشاعت کے لئے بہت بہت شکریہ!

شرف الہدیٰ، پٹنہ

☆ فروری اور مارچ ۲۰۲۵ء کے ''زبان و ادب'' کے شمارے زیر مطالعہ ہیں۔ بڑوں سے لے کر بچوں تک کے لئے حسب روایت یہ کافی حسین ادبی، علمی اور تاریخی گلدستہ ہے، جسے سجانے میں آپ اور آپ کی ٹیم کی کارکردگی قابل مبارک باد ہے۔ صفحات در صفحات دونوں شمارے کے بیرونی اور اندرونی ٹائٹل کی معنویت بے حد پر کشش ہے۔ ''سلام و پیام'' اور حصہ اطفال تک طرح طرح کے معیاری مواد کی یکجائی رسالے کو صفحہ در صفحہ پڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ خطوط غالبؔ کے مختصر ترین، مگر راست متنی مطالعہ سے بعض خصوصی نکات و اشارات اور مرزا غالبؔ کی استفہامی شاعری کے خصوصی اوصاف اور اہمیت کا بھی برجستہ شعری حوالے کے ساتھ نہایت عمدگی سے تذکرہ کیا گیا ہے اور متعلقہ عکوس کو بھی نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ فروری کے شمارے کی تمام مشمولہ چیزیں بھی معیاری و دلچسپ ہیں اور ذہن سازی کی طرف راغب کرتی ہیں، ساتھ ہی بہت کچھ سوچنے، سمجھنے اور جاننے کا بھی موقع فراہم کرتی ہیں۔ تبصرے بھی معلومات بخش ہیں۔

سلطان احمد ساحلؔ، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' فروری ۲۰۲۵ء ملا۔ واقعی اس شمارے میں غالبؔ پر جو مضامین ہیں اور کئی دوسرے مضامین بھی وہ سب بہت اچھے لگے۔ ادبی معنویت کے لحاظ سے سرورق اور پس ورق کی اہمیت روشن ہے اور غالبؔ کے خطوط پر پہلا مضمون اپنی ایک الگ نوعیت کا احساس دلا رہا ہے اور اپنی مطالعاتی خوبی اور خوبصورتی کا معترف بنا رہا ہے۔

جناب محمد شوکت جمال کا یہ مضمون غالبؔ اور بعض شاگردان غالبؔ و احباب غالبؔ پر محیط ہے۔ ''استفہام'' سمجھ داری طلب کرنے کا نام ہے اور یہ طلب سوالوں کے ذریعہ ہی زیادہ موثر ہوتی ہے، اس کا ثبوت غالبؔ کی استفہامی شاعری میں بھرا پڑا ہے، اس رُخ سے جناب علیم اللہ کا مضمون بھی کافی اچھا اور پسندیدہ ہے۔ اس پرچہ میں ریڈیو ڈرامے کے فن پر ڈاکٹر اشرف لون کے مضمون نے بھی نہ صرف موضوع کے رُخ سے متوجہ کیا بلکہ مواد کے رُخ سے آسودہ بھی کر دیا۔ ''افسانے'' کے تحت ''مکان اور آدمی'' کے مطالعہ کا اثر دیر تک ذہن پر چھایا رہا۔ جناب محمد طارق نے ایک بڑی اور کھلی حقیقت کو یہاں بہت خوبصورتی سے فن کے گلدستے میں رکھ دیا ہے۔ کاش! ہم سب اپنے بنائے ہوئے مکان کی صدا سننے کو تیار ہو جائیں! ''بچوں کا زبان و ادب'' نے بھی اپنے زیادہ تر مشمولات سے دل خوش کر دیا۔ یہ سب کچھ اگرچہ بچوں کے نام پر ہے، لیکن اس میں بڑوں کے لئے بھی اچھے خاصے فائدے کے سامان دکھائی دے رہے ہیں، اس لئے کہ ''ماحول بچاؤ'' (ریاض توحیدی) کی بات بچوں کے لئے ہی نہیں اور اسی طرح ''جنگل رے جنگل، جنگل سے منگل'' (ترنم پروین) کا تعلق بھی محض بچوں سے نہیں۔ ماحول کا تحفظ تو چھوٹے بڑے سبھوں کی ذمہ داری ہے۔ سنت روی داس پر محمد توحید اختر کا اور پٹنہ میڈیکل کالج پر محمد رضوان احمد کا مضمون بھی اپنے اپنے موضوع اور معلوماتی مواد کے لحاظ سے بہت کامیاب اور مطالعہ کے لائق ہے۔

ایم احمد زبیر، پٹنہ

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا
زبان وادب

☆	امرود والی اماں	ذکیہ مشہدی	۷۴
☆	میری ماں	انصاری شازیہ صدف	۷۶
☆	املا اور امالہ	ثنا ثمرین	۷۷
☆	حواسِ خمسہ	حسن آتش چاپدانوی	۷۸
☆	ارادے اور آرزو کی برکت	فوزیہ کوثر	۸۰

ذکیہ مشہدی

F-1, Grand Pallavi Court, Judges Court Road, Patna - 800004 (Mob. 9939263613)

امرود والی اماں

بچوں کا اسکول شہر سے ذرا الگ تھلگ تھا، لیکن شہر بڑا نہیں تھا، اس لیے کہیں سے چلو، اسکول جلدی ہی مل جاتا ہے۔ اسکول کیوں، سبھی جگہیں پاس محسوس ہوتی تھیں۔ گھر سے تھوڑی دور چلے تو چوک بازار آ گیا۔ بازار کے الٹے رُخ گھوم جاؤ تو بس اڈہ مل گیا۔ بس اڈے سے اُتر کی طرف نکل لو تو کچہری آ گئی۔ ریلوے اسٹیشن بھی کہیں آس پاس ہی تھا۔ لو بھئی ناپ لیا سارا شہر۔

شہر کی ہی طرح اسکول بھی چھوٹا سا سرکاری اسکول تھا۔ اس میں پہلے درجے سے آٹھویں درجے تک کی پڑھائی ہوا کرتی تھی۔ یہ لڑکوں کا اسکول تھا۔ ان کی عمریں سات سے چودہ پندرہ سال کے آس پاس تھیں۔ اسکول شہر کے آخری سرے پر تھا۔ یہاں سے مضافات شروع ہو جاتے تھے، اس لیے اسکول کے پیچھے کھیت تھے، لیکن ان کھیتوں میں اناج نہیں، سبزیاں اُگائی جاتی تھیں۔ کیلے اور امرود کے باغ بھی تھے۔ ان میں مور گھومتے پھرتے تھے اور پرندے بھی تھے، لیکن وہ درختوں میں چھپے رہتے تھے۔ مور زمین پر دکھائی دیتے کبھی کبھی درختوں کی شاخوں پر بھی دُم لٹکا کر بیٹھے ہوتے تھے۔ برسات کے دنوں میں وہ دُم کو پنکھے کی طرح پھیلا کر ناچتے۔ اس وقت وہ بہت ہی خوبصورت لگا کرتے تھے۔ بڑے بچوں کے کلاس کی کھڑکیوں سی یہ منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ کئی بار تو بچے پڑھنا چھوڑ، باہر کی طرف تکنے لگتے۔ تب ٹیچر ان کی تنبیہ کرتے۔ ابھی سبق کی طرف دھیان دو۔ دوپہر کے کھانے کی چھٹی میں دیکھ لینا۔ ہاں منظر تو بہت خوبصورت ہے۔ رم جھم گرتی پھواریں۔ ٹھنڈی ہوائیں اور ناچتے ہوئے مور۔ بھئی ہمارا جی چاہتا ہے ہم بھی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو جائیں۔ ایک دن ماسٹر صاحب بولے تو بچے خوب ہنسے۔

ماسٹر صاحب بھی انہیں کی طرح سوچتے ہیں۔ ہاں بھئی قدرت کی خوبصورتی تو سب کو بھاتی ہے۔ اب ماسٹر صاحب بھی تو انسان ہی ہیں۔

ٹفن کی چھٹی میں اکثر بچے اسکول کے پیچھے کی طرف جا کھڑے ہوتے۔ وجہ یہ تھی کہ اس چہار دیواری کے بعد ہی کھیت تھے اور باغ بھی۔ اگر کوئی بچہ یہ چہار دیواری پھاند لیتا تو سیدھا باغ میں اتر جاتا، لیکن اس کی اجازت قطعی نہیں تھی۔ اسکول کا چپراسی ڈنڈا لیے برابر چکر لگاتا رہتا تھا۔ سب بچوں پر اس کی نظر رہتی تھی۔

آٹھویں جماعت میں دو بڑے شریر بچے پڑھا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے پڑوسی بھی تھے۔ امجد جو صلاح الدین وکیل کا بیٹا تھا اور منوج جس کے والد دیپک بابو کچہری میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔

دونوں اسکول پیدل آیا کرتے تھے۔ گلے میں بستے لٹکے ہوتے اور ہاتھ میں ٹفن کے ڈبے۔ ایک دن دونوں نے مل کر ایک شرارت رچی۔ وہ اسکول نہیں پہنچے۔ پیچھے کا راستہ پکڑ کر سیدھے اسکول کے پیچھے جا نکلے۔ یعنی سبزیوں کے کھیتوں اور پھلوں کے باغوں میں۔ موسم بڑا سہانا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ موروں کو قریب سے دیکھیں گے۔ پیڑوں سے امرود توڑ کر کھائیں گے۔

مور تو اس دن کوئی ناچتا ہوا نہیں ملا، لیکن آم کے ایک گھنے پیڑ تلے ایک نئی چیز دکھائی دی۔ یہ ایک ٹوٹی پھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ اسکول کی چہار دیواری سے بالکل نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے اندر شاید کوئی تھا بھی۔ ہلتا ڈولتا سا دکھائی دے رہا تھا۔

’کیا بھوت ہوگا......؟‘‘ امجد نے کہا:

’’ارے نہیں بھوت کوئی چیز نہیں ہوتی۔‘‘

منوج نے جواب دیا۔

’’ہاں ماسٹر صاحب نے بتایا تھا اور ابا بھی یہی کہتے ہیں۔ بھوت کچھ نہیں ہوتا، صرف ہمارا وہم ہے۔‘‘ امجد نے حامی بھری۔ ’’اچھا

چلو، چل کے دیکھتے ہیں۔''

دونوں قریب گئے۔ وہاں ایک بوڑھی اماں تھی۔ بڑھاپے سے تھوڑی جھک گئی تھی، لیکن اس کے چہرے پر بڑی نرمی تھی۔ بچوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی، لیکن غور سے دیکھا تو بولی: ''بستہ لیے ہوئے ہو......لگتا ہے......اسکول سے بھاگ کر آئے ہو۔''

بچوں نے سر جھکا لیا۔ مری ہوئی آواز میں بولے:

''بس آج پہلی بار۔''

''اب مت کرنا۔''

بوڑھی اماں نے تنبیہ کی، لیکن اس کا لہجہ نرم تھا۔

''جی'' پھر انہوں نے پوچھا: ''بوڑھی اماں تم یہاں اکیلی کیوں رہتی ہو؟''

''ہمارا کوئی نہیں ہے بیٹا۔ ایک لڑکا تھا وہ اپنے بال بچے لے کر کلکتہ چلا گیا۔''

''یہاں رہ کر آم امرود کے باغ کی رکھوالی کرتے ہیں۔ باغ کا مالک کھانا دے دیتا ہے۔'' بوڑھی اماں نے جواب دیا۔

''تم ڈرتی نہیں بوڑھی اماں؟''

بچوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

''ہمارا کوئی کیا بگاڑے گا بیٹا۔ ڈریں کیوں۔''

''یہاں بھوت نہیں آتے اماں؟''

امجد نے پوچھا۔ اس کے دماغ سے بھوت نکلے نہیں تھے۔

''بھوت کچھ نہیں ہوتا بیٹا۔ بھوت چڑیل سب وہم ہیں۔ یہاں تو ہرے بھرے پیڑ ہیں، سبزیاں ہیں، مور اور دوسری چڑیاں ہیں۔''

تبھی وہاں بھورے رنگ کی چڑیوں کا ایک گروہ آن پہنچا۔ وہ جھونپڑی کے پاس پھدکنے اور شور مچانے لگیں۔

بوڑھی اماں ہنسی: ''دیکھو کتنی پیاری چڑیاں ہیں۔ یہ ہمیشہ گروہ بنا کر رہتی ہیں اور بہت شور مچاتی ہیں۔ انہیں غوغائی کہتے ہیں۔''

''ہاں...... ہاں شاید انگریزی میں......'' منوج نے کہا اور قدرے رک گیا۔

''انگریزی میں سیون سسٹرز یعنی سات بہنیں۔'' امجد کو اچانک یاد آ گیا۔ اس نے ایک کتاب میں چڑیوں کی رنگین تصویریں اور ان کے نام دیکھے تھے۔

بوڑھی اماں نے بانس کی پٹاری کھولی۔ اس میں موٹی روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ وہ اس نے چورا کر کے ان چڑیوں کو ڈال دیا۔ بچے بہت محظوظ ہوئے۔

''تمہارے لیے بھی کچھ ہے۔''

''کیا بوڑھی اماں......؟''

اس نے کونے میں رکھی ایک ڈلیا اٹھائی۔ ڈلیا مونج کی بنی ہوئی تھی اور بڑی رنگین تھی۔ اس میں دو بڑے بڑے امرود تھے۔ ادھ پکے۔ بوڑھی اماں نے ایک ایک امرود دونوں کو دیا۔

''اور اماں تم......؟''

''ہم تو یہیں رہتے ہیں۔ دو چار پھل لے لینے کی اجازت ہے۔ جب چاہیں لے سکتے ہیں۔''

''طوطے کاٹ کے گرا دیتے ہوں گے۔ وہ بھی تم ہی کو مل جاتے ہوں گے۔''

''بیٹا! چڑیوں کے کاٹے ہوئے پھل نہیں کھانے چاہئیں۔ بیماری لگنے کا ڈر ہوتا ہے۔ خاص کر چمگادڑ کے کاٹے پھلوں سے۔''

''اچھا اب گھر جاؤ۔ اتنی دیر سے اسکول جاؤ گے تو پٹائی ہوگی۔ ماں باپ کو بتا دو اور معافی مانگ لو۔''

''ٹھیک ہے بوڑھی اماں، لیکن تم ہم لوگوں کا ٹفن لے لو۔''

بچوں نے اصرار کر کے اسے اپنا اپنا ٹفن دے دیا۔ منوج کے پاس پوری اور آم کا اچار تھا۔ امجد کے پاس گھی لگی دو روٹیاں اور آلو کی سوکھی سبزی تھی۔

بوڑھی عورت کی آنکھیں نم ہو گئیں:

''ایسا کھانا کھائے زمانہ ہوا بیٹا۔'' اس نے کیلے کا پتہ توڑا۔ اس پر کھانا رکھ کر صاف ڈلیا میں رکھ دیا۔

''ہم تم کو پھر یہ کھانا لا دیں گے۔'' دونوں نے کہا۔

''لیکن اسکول چھوڑ کر ہرگز مت آنا۔'' بوڑھی نے پھر کہا۔

''بڑوں سے پوچھ کر ان کو بتا کر ہی ہمیں کچھ دینا۔''

امجد نے مہربان بوڑھی کو سلام کیا اور منوج نے پرنام۔

انصاری شازیہ صدف

Mominpura, Mali Gaon, Dist- Nasik - 423203 (Mob. 8180094547)

میری ماں

میرے پاس ایسی نعمت ہے
جسے میں ماں کہتی ہوں
وہی دنیا بھی ہے میری
وہی جنت بھی ہے میری
دعائیں جب بھی دے مجھ کو
بڑی پیاری وہ لگتی ہے
میں جب بھی مسکراؤں تو
نظر اُس کی ہو چہرے پر
صبح جلدی وہ اُٹھ جائے
میری خاطر میری ماں بھی

میں جب ناراض ہو جاؤں
وہ مجھ کو یوں مناتی ہے
وہی دنیا بھی ہے میری
وہی جنت بھی ہے میری
میری ہر بات وہ مانے
میں جب بھی
یوں ہی کہہ دوں تو
میری تکلیف کو سمجھے
میرے دُکھ اور دردوں کو
میری ماں سب سے پیاری ہے

میری ماں میری جنت ہے
میری خاطر وہ دنیا میں
ہمیشہ یوں کھڑے رہتی
میری بچی نہ ڈر جائے
زمانہ بے رحم لگتا
میرے پاس ایسی نعمت ہے
جسے ماں کہتی ہوں
وہی دنیا بھی ہے میری
وہی جنت بھی ہے میری

❁❁❁

اس نے خوش رہو کہہ کر دونوں کو دعا دی۔ دونوں امرود کھاتے ہوئے وہاں سے واپس ہو گئے۔ بہت ہی مزیدار تازہ امرود تھے۔

گھر کے لوگوں نے انہیں معاف کر دیا، کیوں کہ انہوں نے غلطی مان لی تھی۔ دوسرے ایک بوڑھی عورت کو اپنا کھانا دیا تھا۔ وہ شاید روکھے سوکھے پر گزر کر رہی تھی۔ تبھی اس نے کہا کہ ایسا کھانا کھائے زمانہ ہو گیا۔ کھانا تو روزمرہ کا کھانا ہی تھا۔

''اور بوڑھی اماں بوڑھی اماں مت کہو۔''

امجد کی دادی نے کہا۔''کیا تم ہمیں بوڑھی دادی کہتے ہو؟ ہم بھی تو بوڑھے ہیں۔''

''دادی تو ہماری بھی بوڑھی ہیں۔ اس بوڑھی اماں کی طرح تھوڑی جھک بھی گئی ہیں۔'' منوج نے کہا۔ وہ بھی ساتھ چلا آیا تھا۔

''اچھا ہم اس بوڑھی کو امرود والی اماں کہیں گے۔'' امجد بولا:

منوج نے کہا:''یہ بہت اچھا نام ہے۔ امرود والی اماں۔''

''اور ان سے آپ کہہ کر بات کرنا۔''

اماں بھی گفتگو میں شامل ہو گئی تھیں۔

اگلی بار ہم کب جائیں گے؟

''ارے ابھی تو آئے ہی ہو...... ہفتہ دس دن بعد جانا۔ جاؤ جاکے آج کی پڑھائی گھر پر پوری کرو۔''

''جی دادی......!''

❁❁❁

ثنا ثمرین
Middle School, Shahpur, Sasauna, Dist. Samastipur- 848131

املا اور امالہ

پیارے بچو! مضمون کا چھوٹا سا عنوان آپ کے سامنے ہے۔''املا اور مالہ'' دونوں بظاہر بہت قریب کے ملتے جلتے الفاظ ہیں، لیکن ان دونوں میں لغوی معنی اور اصطلاحی مفہوم کے لحاظ سے فرق ہی نہیں، بڑا فرق ہے۔''املا'' کے لفظی معنی لکھنے لکھوانے کے ہیں۔زبانی یادداشت سے لکھوانا، رسم الخط کے مطابق لکھنا، رسم خط درست کرنے کے لئے مبتدیوں سے لکھوانا، یہ سارا عمل ''املا'' میں داخل ہے اور یہ بات یادرکھنے کی ہے کہ''املا'' لفظ کا ہوتا ہے اور رسم الخط زبان کا۔اصل میں رسم الخط کے مطابق لکھائی کو''املا'' کہا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ املائی غلطی سے بڑے بڑے بنے بنائے کھیل بگڑ جاتے ہیں:

''وہ روزانہ کثرت کرتا ہے''،''اُسے کسرت سے تلاوت کرنے کی عادت ہے''،''وہ لوگ عام کھا رہے ہیں''،''وہ ایک آم آدمی تھا''،''باز لوگ کہتے ہیں''، ''جھوٹ سے بعض آجاؤ''،''ایسا سوچنا غلت ہے''، یہ خیال سہی نہیں ہے''،''تجارت میں نفا بہت ہے''

ان جملوں میں جو غلطیاں ہیں، وہ سب''املا'' کی غلطیاں ہیں اور ان غلطیوں کو سمجھنے کے لئے ان لفظوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے جن کے نیچے نشان لگا دیا گیا ہے۔

پہلے جملے میں ورزش کی بات ہے، اس لحاظ سے''کسرت'' اور دوسرے جملہ میں زیادہ کا مفہوم ہے، اس لحاظ سے''کثرت'' ہونا چاہئے تھا۔تیسرے جملے میں پھل کی بات ہے، چوتھے جملے میں خاص آدمی نہیں''عام'' آدمی کی بات ہے۔''باز'' کا مطلب ہے''رکنا'' اور ''بعض'' سے مراد ہے''کچھ'' اس طرح''بعض لوگ'' اور''باز آجاؤ'' ہونا چاہئے تھا۔لفظ''غلط'' کے آخر میں''ط'' ہونا چاہئے۔اسی طرح خیال کے لئے''صحیح'' ہونا چاہئے تھا اور''نفا'' کی جگہ نفع۔زمانے کے ساتھ''املا'' میں تبدیلی بھی رواج پاتی ہے۔املا قدیم بھی ہوتا ہے اور جدید بھی، ہمیں چاہئے کہ جہاں تک ہوسکے احتیاط کے ساتھ درست اور رائج املا کا استعمال کریں تا کہ ہماری تحریریں غلطیوں سے پاک رہیں۔

لکھائی میں یا بول چال میں''املا'' کا صحیح استعمال ہو تو اس سے کئی دوسرے فائدوں کے علاوہ یہ سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے کہ جو لفظ استعمال ہو رہا ہے، وہ کس زبان سے آیا ہے اور اس طرح جملے میں اس کا معنی بھی بے موقع یا اجنبی نہیں بنتا ہے، ساتھ ہی ساتھ قواعد کی غلطی سے حفاظت ہوتی ہے، ورنہ کاف بیانیہ(کہ) کی جگہ اضافت کی علامت(کے) لکھ دیا جائے اور جملہ اس طرح ہو کہ:

''وہ کہنے لگے کے اس کہ باپ نے چوری کی تھی''

تو اس کا غلط ہونا طے شدہ ہے۔اگر آپ ہاتھی والی''ہ'' کا استعمال ''حلوے'' میں کردیں تو ایسا''ہلوہ'' بھی پھیکا ہوگا جسے کوئی کھا نہ سکے گا یا اس کے برعکس حلوے والی''ح'' سے حاتھی لکھ دیں تو شاید کوئی اس پر بیٹھ نہیں سکے گا۔''املا'' کا تعلق حرف شناسی سے ہے اور جیسا کہ بار بار کہا گیا، املا کی صحت کے لئے مشق اور دھیان ضروری ہے۔

''املا'' سے قطع نظر جہاں تک''امالہ'' کی بات ہے، عربی سے آنے والے اس لفظ کے معنی پھیر دینے، مائل کرنے اور جھکانے کے ہیں۔زبر کو زیر کی طرف مائل کر کے پڑھنا''امالہ'' کہلاتا ہے جیسے رکاب سے رکیب، کتاب سے کتیب۔

''امالہ'' اصل میں علم صرف کی اصطلاح ہے۔الفاظ کے آخر میں آئے ہوئے الف یا''ہ'' کو''ے'' سے بدلنا''امالہ'' کہلاتا ہے، جیسے''مرغا'' سے''مرغے'' اور''بندہ'' سے''بندے''۔ایک قدیم شاعر نے نعت کے شعر میں لفظ''امالہ'' کو بڑی خوبصورتی سے لایا ہے جو مائل ہونے کا مطلب دے رہا ہے۔

حسن آتش چاپدانوی

32, N.C.M. Road, Champdany Bazar, P.o. Champdany,
Dist. Hooghly - 712222 (Mob. 8240920408)

حواسِ خمسہ

قدرت کا انمول ہے تحفہ — بخشا اس نے حواس ِ خمسہ
پانچوں حس ہیں انسانوں میں — افضل ہیں سب حیوانوں میں
شکر کریں ہم کیوں نہ خدا کا — جس نے خزینہ ایسا بخشا
پہلی حس ہے آنکھ ہماری — دنیا رنگیں جس سے ساری

محو ہوں لہو و لعب میں کیجئے ایسا کرم
ہو سوئے طاعت طبیعت کا امالہ یا رسول

یہاں دوسرے مصرع کا مفہوم یہی ہے کہ بیکار باتوں کی طرف سے دل ہٹ جائے اور طبیعت نیک اور بندگی کی طرف مائل ہو جائے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''ان رذائل (ذلیل باتوں) سے ڈرانے کی نہیں صرف امالہ کی ضرورت ہے'' یعنی ایسے عمل کی ضرورت جو ماہیت کو بدل دے۔ طب کی اصطلاح میں ''امالہ'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی مادہ کو بیمار عضو سے دوسرے عضو کی طرف پھیر دیا جائے، لیکن یہاں ہمارے لئے ان تفصیلوں سے زیادہ اہم اور فائدہ مند یہ جاننا ہے کہ گرامر کی دنیا میں ''امالہ'' کا مطلب کیا ہے۔ یہاں ''امالہ'' سے مراد ہے زبر کو زیر کی طرف مائل کر دینا۔

وہ ہائے ہوز یعنی ''ہ'' یا وہ الف مقصورہ یعنی ''ا'' جو الفاظ کے آخر میں ہوں، انہیں جمع کی حالت میں یا حرف ربط کے ساتھ یائے مجہول (ے) سے آپ بدل دیں تو آپ کا یہ عمل ''امالہ'' کہلائے گا۔ مثال کے لئے یہ دو جملے دیکھئے:

''اچھا اچھے کے پاس بیٹھا ہے، برابر بے کے پاس'' اور
''میرا کیا ذکر ہے، بڑے بڑوں نے اس کام میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کی۔''

''امالہ'' کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ جس لفظ کے آخر میں ''ع'' ہو جب اس کے بعد حرف ربط آئے تو اس کے پہلے والے حرف کا زبر، زیر سے بدل دیا جائے جیسے:

''یہ مطلَع اس مطلِع سے بہتر ہے۔''

یہاں لفظ ''مطلع'' کا آخری حرف عین ہے اور اس سے قبل لام پر اصلاً زبر ہے، مگر حرف ربط ''سے'' آجانے کے بعد ''لام'' کا زبر، زیر سے بدل گیا ہے۔ مختصر یہ کہ امالہ کا تعلق لکھنے اور بولنے دونوں سے ہے اور ہمیں اپنے اساتذہ کی مدد سے اس پر دھیان دیتے رہنا ضروری ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اردو میں عام طور سے ''امالہ'' کی دو قواعدی صورتیں ہوتی ہیں۔ مثال کے لئے یہ جملے دیکھئے:

''پڑوسی لڑکے آئے تھے'' —— اور
''اُس لڑکے نے پوچھا۔''

یہاں پہلے جملہ میں ''لڑکے''، ''لڑکا'' کی جمع ہے جس کا ثبوت فعل جمع کا استعمال ہے اور دوسرے جملے میں ''لڑکا'' اس لئے ''لڑکے'' بنا ہے کہ اس کے ساتھ حرف ربط ''نے'' آیا ہے۔ غرض کہ ''املا'' ہو یا ''امالہ'' اس کی خاص قواعدی اہمیت وضرورت ہے۔ ❀❀

ہوتی نہ گر آنکھ ہماری لگتی دنیا ہم کو پیاری؟
کس کو صبح و شام ہیں کہتے دن اور رات ہیں کیسے ہوتے
رنگوں کی پہچان نہ ہوتی گر آنکھوں میں جان نہ ہوتی
لال ہرا کی شان نہ ہوتی

دوسری حس کا نام ہے سننا لہروں کی لرزش کو چننا
شکل میں لہروں کی ، آوازیں کان کے پردوں سے ٹکرائیں
چھوٹی چھوٹی پھر ہڈی سے سننے کے مرکز تک جاتی
سننے کا احساس دلاتی

سونگھنا حس ہے تیسری دیکھو ہر شئے اس کی بو سے تولو
ناک کے اندر چھوٹے چھوٹے ہوتے جانے کتنے خلیے
ہر خلیے میں حسی بال رکھتے ہیں جو بو کا خیال
خوشبو کیا ہے ، بدبو کیا ہے کون ہے اچھا کون برا ہے
ہم کو ہے محسوس کراتی

چکھنے کی حس چوتھی دیکھو منھ کے اندر گر کچھ رکھو
کون ہے کھٹا ، کون ہے میٹھا کون ہے کڑوا ، کون ہے تیکھا
لذت کی پہچان کراتی ہم کو زباں محسوس کراتی
سڑے گلے کا فرق بتاتی

اور پانچویں حس ہے چھونا چھونے کے احساس کا ہونا
جلد ہماری ہے حساس چھونے سے ہوتا احساس
اس پہ لاکھوں بال ہیں ہوتے جو کہ ہم کو جاگتے سوتے
تیز ہواؤں کی لرزش کا سردی گرمی کی گردش کا
جلد ہمیں احساس کراتی

❀❀❀

فوزیہ کوثر
H.No. 4-6, Keesara Mandal, Via. Ghatkir, Dist. Medchal,
Telengana East - 501303 (Mob. 8121936957)

ارادے اور آرزو کی برکت

عاصم جو دسویں کلاس کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اور اس کا چھوٹا بھائی فرحان گھر سے دور کسی مدرسے میں زیر تعلیم تھا۔ کبھی کبھار چھٹیوں میں گھر آیا جایا کرتا تھا۔ ماں سعدیہ خاتون اور باپ ادریس خاں نے عاصم کو اچھی خاصی تربیت دی تھی، اسے اپنی پڑھی ہوئی یہ حدیث مبارک اچھی طرح سے ذہن میں رہی کہ ''جو بڑوں کی عزت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں'' یہ بات بھی اسے یاد ہے کہ ''جو بچے ماں باپ واستاد کی فرماں برداری کرتے ہیں وہ ہمیشہ ترقی کرتے اور آگے رہتے ہیں۔'' ماں باپ کی یہ آرزو تھی کے عاصم اول درجے میں کامیابی حاصل کرے۔ وہ بھی اپنے ماں باپ کی آرزو کو پورا کرنا چاہتا تھا۔ وہ لگاتار دن رات محنت کرنے لگا اور بھر پور پڑھائی پر توجہ دینے لگا۔

سردیوں کا موسم تھا۔ جنوری کا مہینہ چل رہا تھا۔ سنکرانتی کا تہوار عروج پر تھا۔ عاصم کے ساتھی پتنگ، چرخہ و مانجہ خریدنے اور پتنگ اُڑانے میں مصروف تھے اور اُسے بھی بار بار اپنے ساتھ پتنگ اُڑانے کے لئے بلایا کرتے تھے، کبھی کبھی اس کا دل بھی چاہتا تھا کہ دوستوں کے ساتھ کھیل میں حصہ لے، مگر اس نے تو اپنے لئے پڑھائی کا ایک ہدف بنالیا تھا۔ وہ اپنے ارادے کا پکا نکلا، اس نے اپنی خواہش کو دبائے رکھا اور کسی بھی قیمت پر اپنا وقت برباد نہیں ہونے دیا۔

امتحان کا زمانہ قریب آنے تک عاصم نے اپنی تیاری پوری کرلی اور امتحان میں سبھی مضمون کی کاپی بہت اچھے ڈھنگ سے لکھا۔ اب انتظار تھا، امتحان کے رزلٹ کا اور وہ دن بھی آ گیا۔ عاصم نے ساری جماعت میں فرسٹ پوزیشن حاصل کر کے پورے اسکول کا نام روشن و منور کر دیا تھا، پھر عاصم کی تصویر کو اسکول کے باہر لگوا دیا گیا۔

والدین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ شیرنی تقسیم کی گئی، مبارک باد کے کالس آنے لگے۔

ماں باپ دونوں بہت خوش تھے۔ عاصم نے ان کی مراد پوری کردی تھی۔ فرحان بھی بھائی کی کامیابی کے بارے میں سن کر مدرسہ سے دو دن کی چھٹی پر گھر آ گیا تھا، مگر اس کے والدین اس کے کھلنڈرے مزاج سے واقف تھے۔ اس کے اساتذہ بھی بتاتے تھے کہ اسے اور محنت کی ضرورت ہے۔

ایک دن سعدیہ نے فرحان کو بھائی کی مثال دے کر سمجھایا کہ وقت کی قدر کرنے ہی سے کامیابی ملتی ہے۔ اس نے ماں اور باپ دونوں سے وعدہ کیا، بھائی کی مثال سامنے تھی اور پھر وہ یہ پکا ارادہ کر کے مدرسہ کے لئے صبح سویرے بس پر بیٹھ گیا کہ وہ بھی اپنی محنت سے کامیاب ہوکر بھیا کی طرح اپنے ابو اور امی کی آرزو پوری کرے گا۔ اس نے سوچا کہ بھیا کی طرح مجھے بھی اسکالرشپ ملے گی اور تب گاؤں شہر والے دور دور تک ہم بھائیوں کی مثال دیں گے۔ ❁❁

سنہری باتیں

- ☆ اس کی ہمت کے قربان جو نیک کام اخلاص سے کرتا ہے
- ☆ بدوں کے ساتھ نیکی اتنا ہی برا ہے جتنا نیکوں کے ساتھ بدی
- ☆ حسن بناؤ سنگار کے بغیر ہی دل کو موہ لیتا ہے
- ☆ جو زیادہ پیسے والا ہے، وہی زیادہ محتاج ہے
- ☆ تقدیر زیادہ تر دلیر دل آدمی کا ساتھ دیتی ہے
- ☆ مذہب لوگوں کی خدمت میں ہے، صرف تسبیح اور مصلے میں نہیں
- ☆ فطری کمینگی برسوں میں بھی معلوم نہیں ہوتی
- ☆ شیر بھوکا مر جانا پسند کرتا ہے، مگر کتے کا جوٹھا کبھی نہیں کھاتا

غزل

میؔنا نقوی

تری خوشی کے لئے غم کا جام لیتی ہوں
میں اپنی صبح تجھے دے کے شام لیتی ہوں

میں آسمان سے ٹوٹا ستارہ ہوں یوں تو
ترے غرور کا لیکن سلام لیتی ہوں

میں جان بوجھ کے ٹھوکر پہ کھاتی ہوں ٹھوکر
یوں تیری ذات سے میں انتقام لیتی ہوں

مری فنا بھی وفا کے بھرم کو چاہتی ہے
یہ قرض تجھ سے پئے انتظام لیتی ہوں

یہیں کہیں وہ مرا منتظر نہ ہو میؔنا
میں اپنے اُٹھتے ہوئے پاؤں تھام لیتی ہوں

ڈاکٹر میؔنا نقوی کا اصل نام منیر زہرا بنت سید التجا حسین ہے، لیکن ادبی دنیا میں وہ اپنے قلمی نام ''ڈاکٹر میؔنا نقوی'' ہی سے شہرت رکھتی ہیں۔ وہ ۲۰ مئی ۱۹۵۵ء کو نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئیں اور ۱۵ نومبر ۲۰۲۰ء کو ان کی وفات ہوئی۔ انہوں نے ہندی، انگریزی اور سنسکرت میں ایم اے کرنے کے بعد بی اے، ایم ایس کی سند لی تھی۔ وہ اگرچہ ایک میڈیکل ڈاکٹر تھیں، لیکن اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات سے وقت نکال کر شعروادب کی خدمت میں انہماک سے لگی رہتی تھیں۔ میؔنا نقوی کی کتابوں کا سلسلہ ۲۰۰۴ء میں ''سائبان'' سے شروع ہو کر ۲۰۲۰ء میں ''رنگ زندگی کے'' کی اشاعت کے ساتھ دسویں مجموعہ کلام تک پہنچا تھا اور گیارہواں مجموعہ ''کہکشاں'' شائع ہونے ہی کو تھا کہ وہ آخری سفر پر چل گئیں۔ ہوشؔ نعمانی رامپوری سے ادبی رہنمائی لینے والی شاعرہ میؔنا نقوی نہ صرف ادبی اسٹیج پر اپنے کلام کی پیش کش سے مقبول رہیں، بلکہ ادبی رسائل و جرائد میں بھی ان کے کلام کی پر اہتمام اشاعت جاری رہی۔ ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی نے فروری ۲۰۰۹ء کے شمارے میں اُن پر خصوصی گوشہ شائع کیا تھا، جس میں ''میں'' کے عنوان سے ان کی خودنوشت سوانح بھی شامل ہے۔ میؔنا نقوی باحوصلہ خاتون تھیں، ان کے دوسرے شوہر حمید آغا اگرچہ صرف ایک سال (۱۹۸۹ء-۱۹۹۰ء) کی رفاقت کے بعد ہی سڑک حادثہ میں چل بسے، مگر اس غم کے باوجود انہوں نے بچوں کی پرورش و تعلیم اور پیشہ ورانہ ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے شاعری کا سلسلہ قائم رکھا۔ پہلے مجموعہ کے بعد ''درد پت جھڑ کا'' (۲۰۰۵ء ہندی) پھر ''بادبان'' (۲۰۰۷ء اردو) اور ''کرچیاں درد کی'' (اردو/ہندی) ''جاگتی آنکھیں''، ''دھوپ چھاؤں'' (ہندی) ''منزل''، ''آئینہ'' اور ''رنگ زندگی کے'' کی اشاعت ہو چکی ہے۔ میؔنا نقوی غزلوں کے علاوہ نظمیں، گیت اور کویتائیں بھی لکھتی تھیں۔ ان کی شاعری کو ناقدین نے بالعموم نسائی شاعری کی توانا و موثر آواز کہا ہے۔ انہیں تراجم کے علاوہ افسانے، فیچرز، ادبی مقالے اور تبصرے کا بھی صاف ستھرا ذوق تھا۔

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2026

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

Volume : 46 | **May 2025** | **No. 05**

ایڈیٹر، پبلشر ابرار احمد خان، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں
طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy, on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

₹ 15/-